چنگیز ائتماتوف

جمیلہ



اس ناول کے ہیرو ایسے نوجوان لوگ ہیں جنھوں نے ابھی ابھی زندگی میں قدم رکھا ہے۔ سب سے پہلے ان کو محبت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ان کے سامنے اپنے وطن قرغیزیہ کی وسعتیں پھیلی ہیں اور اس کے پہاڑوں اور میدانوں کی انجانی اور ہنوز پراسرار زندگی ان کو دعوت دیتی ہے اور اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سب سے پہلے ان کے سامنے یہ کٹھن اور اہم سوال آتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر آدمی کیسا ہو...



چىنگىز ئايتماتوف

چنگیز ائتماتوف

جمیلہ

دوسرا ایڈیشن

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

ترجمہ : ظ انصاری
ڈیزائین : لیف گریتچن

Чингиз Айтматов
ДЖАМИЛЯ
ПОВЕСТЬ
На языке урду

یہ لو، میں پھر وہیں کھڑا ہوں اسی تصویر کے سامنے، جو کچھ بڑی نہیں ہے اور معمولی سے فریم میں لگی ہوئی ہے۔ کل صبح ہوتے ہی مجھے گاؤں روانہ ہو جانا ہے۔ اور میں اس تصویر کو یوں دیر تک تکے جا رہا ہوں جیسے یہ سفر کے سلسلے میں کوئی اچھا مشورہ دے سکتی ہے۔

یہ تصویر میں نے آج تک کبھی نمائش کے لئے نہیں رکھی۔ بلکہ یہاں تک ہے کہ جب گاؤں سے میرے رشتہ‌دار مہمان آتے ہیں تو کوشش کرتا ہوں کہ تصویر سامنے سے ہٹا دی جائے۔ اس تصویر میں ایسی کوئی شرمانے کی بات نہیں مگر آرٹ سے بھی اسے دور کا واسطہ نہیں ہے۔ تصویر اتنی ہی معمولی ہے جتنی وہ زمین جو اس تصویر میں دکھائی گئی ہے۔

تصویر کے پس‌منظر میں خزاں کے پھیکے بے‌رنگ آسمان کا کنارہ نظر آتا ہے۔ دور پہاڑی سلسلے پر ہوا کے جھونکے تیزی سے بکھرتے ہوئے بادلوں کے دامن اڑا رہے ہیں۔ پیش‌منظر میں سرخی مائل بھورا اسٹیپی

میدان پھیلا ہے۔ راستہ سیاہ اور نم ہے کیوں کہ ابھی بارش ہو چکی ہے۔ راستے کے کنارے کنارے نوکدار گھاس کی سوکھی جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں۔ بارش میں مٹی ہوئی ڈگر کے ساتھ دو راہگیروں کے نشان قدم چلے گئے ہیں اور راستہ جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے یہ نشان اتنے ہی ہلکے ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ معلوم ہوتا ہے کہ راہگیر ایک قدم اور آگے بڑھیں تو تصویر سے باہر نکل جائیں۔ ان راہگیروں میں سے ایک ہے جو... مگر میں کچھ آگے بڑھا جاتا ہوں۔

یہ قصہ ہے جب کا کہ میں نوجوانی کے دور میں قدم رکھ رہا تھا۔ جنگ کا تیسرا سال تھا۔ بہت دور دراز کے مقامات پر کہیں کورسک میں، اوریل میں ہمارے باپ بھائی میدان جنگ میں صف‌آرا تھے اور ہم پندرہ پندرہ برس کی عمروں کے لڑکے بالے کالخوز میں جٹے ہوئے تھے۔ روزمرہ کی سخت محنت جو بڑوں کے کرنے کی تھی ہمارے کمزور شانوں پر آ پڑی تھی۔ خاص طور سے فصل کٹنے کے دن بہت جی توڑکر کام کرنا ہوتا تھا۔ سارا سارا ہفتہ گزر جاتا اور گھر تک جانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی تھی کھیتوں میں، گاہنے کی جگہ پر یا اسٹیشن جانے والی سڑک پر اناج لےجاتے ہوئے۔

ایک ایسے ہی تپتے ہوئے دن کا ذکر ہے جب فصل کاٹتے کاٹتے ہماری درانتیاں جلنے لگیں تو میں

اسٹیشن سے اپنے خالی چھکڑے پر واپس آ رہا تھا۔ میں نے طے کیا کہ گھر کی طرف ہو لیا جائے۔

بالکل ہی گھاٹ کے پاس پہاڑی دامن میں، جہاں پر سڑک ختم ہوتی ہے، دو احاطے ہیں۔ اندر مکانات اور باہر کچی اینٹوں کی خوب مضبوط دیوار کھینچی ہوئی۔ پائیں باغ کے گرداگرد حور کے سیدھے قدوالے اونچے درخت کھڑے ہیں۔ یہی ہیں ہمارے مکان۔ ایک زمانے سے ہم دو ہمسائے خاندان ان مکانوں میں رہتے چلے آئے ہیں۔ میں خود اس خاندان سے ہوں جو بڑے مکان میں رہتا ہے۔ میرے دو بھائی تھے، دونوں مجھ سے بڑے، دونوں کنوارے، دونوں لام پر گئے ہوئے ہیں۔ اور ایک زمانے سے ان کے بارے میں کچھ خیر خبر نہیں۔

میرے باپ کافی عمر کے بڑھئی ہیں۔ تڑکے سے نماز پڑھ کر باہر احاطے میں چلے جاتے، بڑھئی کھاتے میں جٹ جاتے تھے اور شام کو کافی دیر سے گھر میں قدم رکھتے تھے۔

اندر صرف میری ماں رہتی تھیں اور بہن۔

برابر کے احاطے میں بلکہ گاؤں والوں کے بقول چھوٹے مکان میں ہمارے قریبی رشتہ‌دار رہتے ہیں۔ ممکن ہے ہمارے دادا پر دادا آپس میں سگے بھائی رہے ہوں مگر میں نے انہیں قریبی رشتہ‌دار اس لئے کہا کہ ہم لوگ ایک خاندان کی طرح رہتے سہتے ہیں۔ ہمارے

یہاں کا یہ دستور خانہ‌بدوشی کے وقت سے چلا آ رہا ہے جب ہمارے ان کے دادا پر دادا ایک ساتھہ خیمے لگاتے اکھیڑتے پھرتے تھے اور ایک ساتھہ مویشی چراتے تھے۔ ہم نے بھی یہی چلن رکھا۔ جب گاؤں میں پنچائتی کھیتی کی آمد ہوئی تو ہمارے اور ہمسائے کے باپ نے مل کر برابر میں گھر بنا لئے۔ اور ایک ہم ہی نہیں بلکہ ساری یہ جو ارالسکی سڑک ہے جو دریاؤں کے بیچ میں چلی گئی ہے اس کے کنارے بسے ہوئے قبیلے کے تمام لوگ، ہم سب کے سب ایک ہی مورث اعلا کی اولاد ہیں۔

ابھی پنچائتی کھیتی کو بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ چھوٹے والے مکان کا مالک دنیا سے سدھار گیا۔ مرحوم کی بیوی دو کم‌سن بیٹوں کے ساتھہ رہ گئی۔ پرانا دستور یہ تھا اور اسے قبیلے کی عادت یا رواج سمجھہ کر گاؤں میں پابندی کی جاتی تھی کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے اور اس کے بیٹے بھی ہوں تو اسے قبیلے سے باہر نہیں نکالتے چناں‌چہ ہمارے کنبے والوں نے اس مرحوم کی بیوہ کو میرے باپ سے بیاہ دیا۔ مرنےوالے کے سب سے قریبی رشتہ دار ہونے کے باعث میرے باپ پر ذمہ‌داری آئی کہ وہ دادا پر دادا کی روحوں کے سامنے اپنا یہ فرض ادا کریں۔

اس صورت سے ہمارا یہ دوسرا خاندان وجود میں آیا۔ چھوٹےوالے مکان کو بذات خود الگ ایک گھرانہ شمار

کیا جاتا تھا: اس کا اپنا پائیں باغ تھا، اپنے مویشی تھے لیکن دراصل رہن سہن ہمارا ان کا ایک ساتھہ تھا۔

چھوٹے والے گھر نے بھی اپنے دونوں بیٹوں کو فوج میں بھرتی کرا دیا۔ بڑا جو تھا صادق، شادی کرنے کے کچھہ دن بعد ہی روانہ ہو گیا۔ ان دونوں بھائیوں کے خط بھی آتے رہے۔ البتہ یہ ہے کہ خط بہت دیر دیر سے آتے تھے۔

چھوٹےوالے مکان میں ایک تو ماں کی ذات تھی جنہیں میں ''کیچی آپا،، کہتا تھا یعنی چھوٹی اماں اور ایک ان کی بہو یعنی صادق کی دلھن۔ صبح سے شام تک دونوں کالخوز میں کام کیا کرتی تھیں۔ میری چھوٹی اماں بہت اچھے دل کی، ہر حال میں راضی برضا، بردبار عورت تھیں اور ہر کام میں ایسی چست کہ جوانوں سے پیچھے نہ رہنے والی، چاہے عریق یعنی آبپاشی کی نالی کھودنا ہو یا کھیتوں کی سینچائی۔ مختصر یہ کہ وہ کدال کو خوب مضبوطی سے تھام سکتی تھیں۔ قسمت دیکھئے کہ انہیں اپنی محنت کا صلہ بھی ملا تو بہو کی صورت میں کہ وہ بھی محنتی عورت نکلی۔ جمیلہ اپنی ساس کی بالکل نقل تھی، ان تھک اور پھرتیلی، ہاں زرا مزاج دوسرا پایا تھا۔

مجھہ کو جمیلہ دل سے پسند تھی اور وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔ ویسے تو ہم دونوں میں گہری دوستی تھی لیکن یہ ہمت کبھی نہیں پڑی کہ ایک

دوسرے کا نام لے کر پکاریں۔ اگر ہم الگ الگ خاندان سے ہوتے تو میں اسے جمیلہ ہی کہتا لیکن اب یہ تھا کہ میں اسے اپنی زبان میں ”جینے“ کہتا یعنی بڑی بھابی اور وہ مجھے ”کیچینے بالا“ کہتی یعنی چھوٹے بھیا۔ حالاں کہ دیکھئے تو میں بالکل چھوٹا بھیا نہیں تھا۔ ہماری عمروں میں چھوٹے بڑے کا فرق بہت ہی معمولی سا ہوگا۔ مگر ہمارے دیہات کا یہی چلن تھا۔ بھوئیں اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی کو ”کیچینے بالا“ یا ”میرے کائینی“ کہہ کر پکارتی تھیں۔

دونوں احاطوں کی گھر گرہستی اکیلی میری ماں ہی کرتی تھیں۔ بہن ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ کیا ننھی سی جان تھی تاگوں سے چوٹیاں گندھی ہوئی کہ دیکھ کر ہنسی آئے۔ میں کبھی بھول نہیں سکتا کہ ان مصیبت کے دنوں میں میری بہن نے کیسے جی توڑ کے کام کیا ہے۔ وہی تھی جو دونوں گھروں کے جانور چرانے جنگل لے جاتی، وہی گوبھر سمیٹتی اور لکڑی چن کر لاتی تاکہ گھر میں ایندھن کا انتظام ہر وقت رہے۔ وہی بیچاری میری چپٹی نکووالی بہن تھی جو تنہائی کے کڑے دنوں میں ماں کے دم کے ساتھ رہی اور ان کا جی بہلاتی رہی تاکہ جوان بیٹوں کے لاپتہ ہو جانے سے جو الٹے الٹے خیال دل میں آتے تھے ان کی یورش نہ ہونے پائے۔

یہ سب میری ماں کے دم قدم کی برکت تھی کہ ہمارے بڑے کنبے میں اتفاق اور خوش دلی بھی تھی اور ضرورت کا سامان بھی مہیا رہتا تھا۔ دونوں گھروں کی گرہستی پر انہیں پورا اختیار حاصل تھا اور وہی گھر چلاتی تھیں۔ ہمارے اٹھاؤ چولھا بزرگوں کے گھر میں وہ اس وقت آئی تھیں جب بالکل چھوٹی سی تھیں۔ اس کے بعد سے انہوں نے ہمیشہ بزرگوں کی یاد کو سینے سے لگا کے رکھا اور گھربار کے انتظام میں حق و انصاف کے اصولوں پر ہمیشہ عمل کیا۔ گاؤں میں سب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انہیں شریف، دیانتدار اور دانا گرہستن شمار کرتے تھے۔ گھر کے اندر بھی سب ان کی بات مانتے تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ گاؤں والے میرے باپ کو اپنے خاندان کا بزرگ نہیں سمجھتے تھے۔ بارہا ایسا سننے میں آیا کہ لوگ ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے سے کہتے ”ارے بس، کیا ہوگا استاد کے پاس جا کر، اسے اپنی کلھاڑی کے سوا کیا خبر، ان کے ہاں تو ایک بڑی بی کی عقل چلتی ہے، کام کرانا ہے تو بڑی بی کے پاس جاؤ...“

یہاں یہ بھی ذکر کر دوں کہ کچی عمر کے باوجود میں بھی گھریلو معاملوں میں اکثر ٹانگ اڑاتا رہتا تھا۔ اور وجہ اس کی یہ کہ بڑے بھائی تو میدان جنگ کو سدھار چکے تھے، اب میں ہی میں تھا۔ اکثر یوں ہی چھیڑنے کو اور بعض اوقات سچ مچ مجھ کو

دو خاندانوں کا " جگیت "، ان کا رکھوالا اور کماؤپوت کہا جاتا تھا۔ اپنے بارے میں یہ الفاظ سن کر میری گردن فخر سے اونچی ہو جاتی تھی اور ذمہ‌داری کا احساس کبھی دامن نہ چھوڑتا تھا۔ اور خود اماں بھی میری آزادی اور مختاری کو بڑھاوا دیتی تھیں۔ ان کی آرزو تھی کہ میں کھیتی میں، گھریلو معاملات میں بھی حصہ لوں اور ہوشیار اور قدم آگے رکھنےوالا آدمی بنوں، اپنے باپ کی طرح نہیں جو روزانہ صبح سے شام تک منہ سئے لکڑی چھیلتے اور رندا پھیرتے رہتے تھے۔

تو یہ ہوا کہ میں نے گھر کے پاس پہنچ کر بید تلے چھکڑا روک لیا، راس ڈھیلی کردی اور پھاٹک کی طرف چل دیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ احاطے میں اورعظمت موجود ہے، ہماری ٹیم کا لیڈر۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور حسب معمول اس کی بیساکھی زین سے بندھی ہوئی تھی۔ قریب میں میری اماں کھڑی تھیں، کسی بات پر دونوں میں بحث ہو رہی تھی۔ جب میں اور نزدیک پہنچا تو اماں کو یہ کہتے سنا:

" یہ نہیں ہوگا! خدا کا خوف کرو ۔ بھلا یہ کہاں کا دستور ہے کہ عورت ذات گاڑی پر اناج کے بورے ڈھوتی پھرے۔ نہیں، بابا، میری بہو کو اس کے حال پر چھوڑو ۔ وہ جیسے کام کرتی تھی ویسے ہی کرے گی۔ یوں ہی مجھے دن کا اجالا نہیں سوجھتا ۔ ذرا دو دو گھروں کا انتظام کرکے دیکھو! خیر چلو، بیٹی میری

بڑی ہو رہی ہے... ہفتہ بھر ہونے کو آیا، کمر سیدھی نہیں کی، ٹوٹی جا رہی ہے کمریا جیسے۔ اور ادھر دیکھو مکئی سوکھی جا رہی ہے۔ پانی نہیں ملا!،، ماں نے ذرا غصے میں کہا اور اپنے کرتے کے گریبان میں دوپٹے کو مروڑتی رہیں۔ رنج یا غصے میں ان کی انگلیاں اسی پر چلتی تھیں۔

''آپ بھی کیا آدمی ہیں! ،، اورعظمت نے منہ بنا کر کہا اور گھوڑے کی زین پر اچکا۔ ''اگر میری ٹانگ سلامت ہوتی اور یہ لکڑی کا گھوڑا نہ لگا ہوتا تو میں بھلا آپ سے ایسی التجا کرتا؟ جی ہاں اچھا تو یہی تھا کہ میں جیسے پہلے کرتا تھا اب بھی چھکڑے پر خود ہی بورے لادتا اور خود ہی کوچوانی کرتا! یہ کام عورتوں کے کرنے کا نہیں ہے، جانتا ہوں، مگر بتائیے کہاں سے لائیں مردوں کو؟ سوچا کہ جو فوج میں گئے ہیں ان کے گھروالوں سے کہیں سنیں مگر آپ اپنی بہو کو منع کرتی ہیں، اب بتائیے ہمیں تو اوپر سے ڈانٹ پڑتی ہے... فوجیوں کو روٹی چاہئے اور ہم روٹی بھیجنے کے پلان میں کھنڈت ڈالے دے رہے ہیں۔ ایسے کیسے چلے گا، کیا حاصل اس کا؟،،

میں زمین پر اپنا چابک سرکاتا ہوا اورعظمت کے پاس پہنچا اور جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ بے انتہا خوش ہو گیا۔ صاف دکھائی دیا کہ اسے کوئی خاص خیال آیا ہے۔

”اچھا چلئے، اپنی بہو کو نکالتے اتنی ڈرتی ہیں آپ، تو یہ لیجئے، اس کا دیور موجود ہے،، اس نے خوشی سے میری طرف اشارہ کیا۔ ”وہ کسی کو بھابی کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دے گا۔ اب تو کوئی کھٹکا نہیں! سعید ہمارا پٹھا خوب ہے۔ یہی جوان تو ہیں جن کی بدولت ہمیں روٹی جڑتی ہے۔ بس ان ہی سے ہمارے سارے کام چلتے ہیں...،،

اماں نے اس شخص کو بات پوری نہیں کرنے دی۔

”اوئی اللہ، ذرا صورت تو دیکھ اپنی، آوارہ گرد کہیں کا!،، وہ مجھے دیکھتے ہی چیخ پڑیں۔ ”بال بالکل جھبرے ہو رہے ہیں۔ باواجان بھی خوب آدمی ہیں، بیٹے کی حجامت بنانے کو وقت نہیں ملتا۔،،

”خیر، تو پھر ایسے سہی۔ آج بیٹا ماں باپ کے پاس چونچلے کرلے، حجامت بنوالے اور پھر،، اورعظمت نے ہوشیاری سے اماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”سعید، آج گھر پر رہو۔ آرام کر لو۔ گھوڑوں کو کھلا پلا دو اور کل صبح سے ایک اور چھکڑا جمیلہ کے حوالے کریں گے۔ تم دونوں ساتھ کام کیا کرنا۔ ادھر دیکھو میری طرف۔ جمیلہ کی جوابدہی تم کروگے۔ اور آپ بی‌بی جی بالکل فکر نہ کریں۔ سعید کے ہوتے جمیلہ کو کوئی اندیشہ نہیں۔ اور اگر اس کی بات بن گئی تو میں ان کے ساتھ دانیار کو لگا دوں گا۔ آپ تو اسے خوب جانتی ہیں۔ اچھا شریف بے زبان لڑکا ہے اور ابھی تھوڑے

دن ہونے لام پر سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک رہے گا، تینوں مل کر اسٹیشن کو اناج ڈھویا کریں گے ، بھلا کس کی مجال ہے کہ آپ کی بہو کو ہاتھ تو لگا لے ؟ ٹھیک ہے کیوں بے سعید؟ تیرا کیا خیال ہے؟ ہم جمیلہ کو گاڑی‌بان لگانا چاہتے ہیں ۔ ماں راضی نہیں ہوتی ۔ تو ہی ماں کو سمجھا، بھائی ۔ ،،

ٹیم کے لیڈر اورعظمت کی تعریف سے میرا جی خوش ہو گیا ۔ اور یہ بھی اچھا لگا کہ وہ مجھ سے ایسے مشورہ کر رہا ہے جیسے پکی عمر کے آدمی سے کیا جاتا ہے۔ اس کے زبان پر لانے کی دیر تھی اور فوراً میری آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر گیا کہ جمیلہ کے ساتھ اسٹیشن پر گاڑی لانا لےجانا کیا مزے کا رہیگا۔ منہ پر سنجیدگی طاری کرکے میں نے ماں سے کہا :

” کیا بگڑ جائےگا اس کا ۔ بھلا کوئی بھیڑیے تھوڑی کھا جائیں گے اسے ؟ ،،

اور جیسے پکے گاڑی‌بان کرتے ہیں، دانتوں میں تھوک چپچپاتے ہوئے اور خوب کاندھے مٹکا مٹکاکر چلنے لگا اور چابک اپنے پیچھے گھسیٹا ۔

” افوہ رے ! ،، ماں تعجب سے مجھے تکنے لگیں مگر اس تعجب میں خوشی بھی تھی ۔ ساتھ ہی انہوں نے ذرا غصے سے ڈانٹ کر کہا ” دیکھتا جا، تجھے بھیڑیے دکھاؤں گی میں ۔ بڑا آیا کہیں کا، تجھے کیا خبر بھیڑیا کیا ہوتا ہے ! ،،

" اور کسے خبر ہوگی اسے نہیں ہوگی تو۔ وہی تو دو دو کنبوں کو پال رہا ہے۔ آپ کو تو اس پر فخر کرنا چاہئیے ! "، اورعظمت نے میری طرفداری کی۔ مگر ماں کی طرف بھی فکر مندی سے ایک نظر کر لی کہ کہیں وہ اپنی بات پر اڑ نہ جائیں۔

ماں نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ گردن جھکا لی اور بھاری سانس لیتے ہوئے زبان سے صرف اتنا کہا :

" کنبوں کو پالنےوالا ابھی کہاں سے ہو گیا، ابھی تو بچہ ہے، بچے کی جان پر رات دن کی محنت پڑ گئی ہے۔ اللہ جانے ہمارے پالنے والے کہاں ہونگے۔ گھر چھوڑ کر نکل گئے، جیسے گھر نہیں اجاڑ خیمے ہوں۔ "

میں وہاں سے دور کھسک گیا تھا۔ ماں نے پھر کیا کہا، سنائی نہیں دیا۔ چلتے وقت مکان کے ایک کونے میں اپنا کوڑا اس طرح جھٹکا کہ خاک اڑی اور بہن تک کی مسکراہٹ کا جواب دئے بغیر دروازے کی طرف پاؤں پٹکتا ہوا بڑھا۔ میری بہن گوبھر تھاپ تھاپ کے اپلے بنا رہی تھی۔ دروازے میں پہنچ کر میں پھسکڑا مارکر بیٹھ گیا اور ڈھیلےپن کے ساتھ گھڑے سے پانی لے لے کر ہاتھ دھونے لگا۔ پھر کمرے میں قدم رکھا۔ کھٹے دودھ یا چاچھ کا ایک پیالہ چڑھایا اور دوسرا پیالہ روٹی کا ٹکڑا اس میں ڈال کر کھڑکی کی سل پر رکھ دیا۔

اماں اور ان کے ساتھ اورعظمت ابھی احاطے میں ھی کھڑا تھا ۔ اب ان میں بحثابحثی بند ہو چکی تھی البتہ بڑے اطمینان سے دھیمی آواز میں باتیں ہو رہی تھیں ۔ لازمی بات ھے کہ میرے بھائیوں کے متعلق کہا سنا جا رہا ہوگا ۔ کبھی کبھی اماں سوجی ہوئی آنکھیں دامن سے پونچھ لیتی تھیں اور فکرمندی سے گردن ہلا دیتی تھیں اورعظمت کے جواب میں، جو ظاہر تھا کہ تسلی کے دو بول ان سے کہہ رہا ہوگا ۔ اور برابر آنکھیں اٹھاکر دھندلی نظروں سے کہیں بہت دور، درختوں کے اوپر دیکھنے لگتی تھیں جیسے آس ہو کہ جوان بیٹے وہاں کہیں نظر آ جائیں گے ۔

معلوم ہوتا ھے کہ اپنے غم سے کلیجہ مسوس کر ماں اورعظمت کے کہنے پر راضی ہو گئیں اور وہ بھی اس سے مطمئن ہوکر کہ چلو میرا کہنا مانا گیا، ،ڑا، گھوڑے کو چابک رسید کیا اور احاطے سے دلکی چال چل دیا ۔

ظاہر بات ھے کہ اس وقت نا ماں کو گمان تھا، نہ مجھے کہ آج کے واقعے کا انت کہاں ہونےوالا ھے۔

مجھے اس میں ذرا شک نہیں تھا کہ جمیلہ ایک جوڑی کی گھوڑا گاڑی سنبھال لے گی ۔ گھوڑوں کی پہچان ویسے بھی تھی اس کو، خود جو پہاڑی گڈوں بکایر کے ایک گھوڑ سال والے کی بیٹی ٹھیری ۔ ہمارا بھائی صادق بھی گھوڑ سال رکھتا تھا ۔ ایک بار موسم بہار کی گھوڑ

دوڑ میں جمیلہ کا گھوڑا آ گے نکل گیا اور وہ زور لگانے پر بھی اس کو نہیں پہنچ سکا۔ کیا خبر سچ ہے کہ نہیں، لیکن لوگوں سے سنا ہے کہ گھوڑدوڑ میں صادق کی جو کرکری ہوئی اس کے بعد ہی اس نے جمیلہ کا اغوا کیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، بعضوں کا کہنا ہے کہ نہیں، ان میں محبت کی شادی ہوئی تھی۔ خیر اب جو بھی ہوا ہو، لے دے کے دونوں صرف چار مہینے ساتھہ رہے۔ اتنے میں جنگ چھڑ گئی اور صادق کو فوج کی طرف سے بلاوا آگیا۔

باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بیٹا بھی وہی، بیٹی بھی وہی۔ میں جانوں وجہ یہ ہوگی کہ بچپن سے اپنے باپ کے ساتھہ گھوڑوں کی دیکھہ بھال کرتی تھی اور اس سے جمیلہ کے کیرکٹر میں مردوں کی بعض خاصیتیں آگئی تھیں، تیزی بلکہ اس سے بڑھہ کر سختی اور اکل کھراپن۔ کام کرنے میں بھی ایسی جٹتی تھی کہ بالکل مردوں کی سی لگن۔ ساتھہ‌والیوں سے نبٹنا بھی آتا تھا اسے۔ زرا خواہ مخواہ کوئی چھیڑ کے دیکھے، پھر کیا مجال جو گالم گلوچ میں اس سے آگے نکل جائے۔ اور ایسے واقعے بھی ہوئے ہیں کہ جمیلہ نے مقابل کے جھونٹے پکڑ کے طبیعت صاف کر دی۔

کئی بار پاس پڑوس سے اس کی شکایتیں آئیں:

" واہ بہن تمہاری یہ بہو بھی خوب آئی ہے، ابھی بیاہ کے گھر میں قدم رکھتے اٹھوارہ نہیں ہوا کہ گز

بھر کی زبان نکال دی۔ نہ کسی کا لحاظ، نہ کسی سے حیا شرم ! ''

اماں اس پر بگڑ کر جواب دیتیں '' ہاں اچھا تو ہے کہ بہو ایسی ملی۔ دو ٹوک سچ بولنا اسے بھاتا ہے۔ یہ نہیں کہ منہ پر کچھ، پیٹھ پیچھے کچھ، چپکے چپکے ادھر کی ادھر کرنا۔ تمہاری جو یہ منہ میں گھنگھنیاں بھری چھوکریاں ہیں نا، یہ بڑی چپ چھنال ہیں، گندے انڈے۔ باہر سے صاف ستھری ، اندر سے بساند بھری۔ ''

میرے ابا اور سوتیلی ماں کبھی جمیلہ پر ویسی روک ٹوک نہیں کرتے تھے جیسی ساس سسر عام طور سے کیا کرتے ہیں۔ ان دونوں کا برتاؤ اچھا تھا۔ پیار محبت سے پیش آتے اور بس یہی ان کی دعا یا تمنا تھی کہ بیٹی، خدا پر ایمان اور شوہر سے وفاداری بنی رہے۔

میں بھی ان کے دل کی بات سمجھتا تھا۔ جن ماں باپ کے چار کڑیل جوان فوج کو سدھار گئے ہوں اور دو دو گھروں میں ایک اکیلی بہو رہ گئی ہو انہیں لے دے کے بس اسی کے دم کا سہارا تھا اور وہ اسے عزیز رکھتے تھے۔ مگر خود میری اماں اس سے اتنا پیار کیوں کرتی تھیں سمجھ میں نہ آیا۔ اماں ایسی عورت نہیں تھیں کہ یوں ہی کسی ایرے غیرے کو گلے لگالیں۔ ان کا مزاج ٹھیرا رعب داب رکھنے اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے

کا۔ جینے کے انہوں نے کچھہ اپنے اصول بنا رکھے تھے اور کیا مجال جو زرا ان میں بل آ جائے۔ ان کا دستور تھا کہ ہر سال ادھر بہار آنے کے دن ہوئے اور ادھر انہوں نے وہ پرانی چھولداری جو بابا نے کبھی نوجوانی میں تیار کی ہوگی، نکال کر احاطے میں لگا دی۔ اور اس میں انگڑ کھنگڑ کی دھونی دے دی۔ اپنی اولاد کو بھی اماں نے کڑےپن کے ساتھہ ایسی تربیت دی تھی کہ وہ محنت میں جی لگائیں اور بڑوں کا حکم بجالائیں۔ خاندان کے ہر فرد بشر پر ان کا حکم چلتا تھا اور کسی کو چوں‌چرا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

مگر جمیلہ کو دیکھئے تو سسرال میں قدم رکھتے ہی اس نے دوسرا رنگ اختیار کیا۔ وہ ایسی نہیں نکلی جیسا بتاتے ہیں کہ دلھن کو ہونا چاہئے۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے کہ وہ اپنے بڑوں کے ساتھہ ادب سے پیش آتی تھی، ان کا کہنا سنتی تھی لیکن ان کے سامنے ایک تو سر کبھی اس نے نہ جھکایا، گھونگھٹ نہ نکالا اور پھر دوسری بہوؤں کی طرح ایک طرف کو مڑ کر چپکے چپکے کیڑے بھی نہیں نکالے۔ اس کی یہ عادت تھی: منہ پر سب کے سامنے، جیسا جی میں آیا، ویسا ہی کہہ دیا اور اپنی رائے تڑ سے کہہ دینے میں کبھی ہاک نہیں کیا۔ اماں بھی بات بات میں اپنی بہو کی حامی بھرتی تھیں، اسی کی ہاں میں ہاں ملاتی تھیں — مگر فیصلے والی بات اپنی مٹھی میں رکھتی تھیں۔

مجھے لگتا ہے کہ اماں نے جمیلہ کی ھستی میں، اس کے کھرےپن میں، سیدھی سچی طبیعت میں اپنی جوڑ دیکھہ لی اور دل ھی دل میں سوچ لیا کہ کبھی نہ کبھی اسی کو اپنی جگہ بٹھاؤں گی، قائم مقام بناؤں گی، ایسی مٹھی میں رکھنے والی گرھستن اور بڑی اماں بنا دوں گی جو میری طرح سگھڑپنے سے گھر چلاتی رہے۔

اماں جمیلہ کو سکھایا کرتی تھیں '' بیٹی، اللہ کا شکر کر کہ ایسے بھرے پرے اور برکتوں‌والے کنبے سے تیرا سنجوگ ھوا۔ تیرے بھاگ اچھے تھے۔ عورت کا سبھاگ اسی میں ہے کہ بچے ھوں، گھر بھرا رہے۔ اور تو ایسی مقدروالی ہے اللہ کے فضل سے کہ ھماری عمر بھر کی کمائی سب تجھی کو ملے گی۔ دیکھتی ہے، ھم اپنے ساتھہ قبر میں تو لے جانے سے رہے۔ بس قسمت تیرا ساتھہ دے جائے — اور تو جانے، قسمت اس کا ساتھہ دیتی ہے جو اپنی عزت آبرو کا، اپنے ایمان کا پاس کرے۔ یہ میری نصیحت کبھی مت بھولیو، ھمیشہ اس پر عمل کیجیو!،،

پھر بھی جمیلہ میں ایسی کوئی بات ضرور تھی جس کا دھڑکا دونوں ساسوں کو لگا رھتا تھا۔ بڑی ھی بےباک اور کھلے دیدے کی ھنسوڑ لڑکی تھی وہ۔ بالکل بچوں کی طرح سے۔ بس کبھی یوں ھی بیٹھے بٹھائے قہقہہ مار کر ھنس پڑتی تھی اور خوشی کے مارے کھلکھلائے جاتی تھی۔ جب کام سے نمٹ کر گھر آتی تو ٹھیک سے

چلا نہیں جاتا تھا۔ نالیوں عریقوں پر سے پھلانگتی، کدکڑے مارتی بھاگی ہوئی آتی تھی اور آتے ہی آپ سے آپ کبھی ایک ساس کے گلے میں باھیں ڈالتی، اسے گلے لگاتی، چومتی اور کبھی دوسری ساس کو۔

ایک پسند اور تھی اس لڑکی کی — گانا۔ کچھ نہ کچھ گاتی ہی رہتی تھی اور بڑوں کی موجودگی سے شرماتی نہیں تھی۔ ظاہر بات ہے کہ ہمارے گاؤں والوں میں بہو کے جو طور طریقے اوپر سے چلے آتے تھے ان سے جمیلہ کی یہ عادتیں میل نہیں کھاتی تھیں۔ مگر دونوں ساسیں یہ سوچ کر چپ تھیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ خود سنبھل جائے گی۔ اب دیکھو نا۔ الھڑپنے کی عمر میں سب ایسے ہی کرتی ہیں۔ میرے لئے تو دنیا میں سب سے بڑھ کر جمیلہ کی ذات تھی۔ جب ہم دونوں کا ساتھ ہوتا تو خوب لطف رہتا، بے وجہ، بے سبب، خوب جی کھول کے قہقہے مارے جاتے۔ اور احاطے میں ایک دوسرے کو پکڑنے کے لئے اچھلتے کودتے پھرتے۔

جمیلہ یوں بھی سوہنی تھی۔ چھریرا سڈول بدن۔ سیدھے سخت بال دو چوٹیوں میں گندھے ہوئے، دونوں طرف موٹی موٹی چوٹیاں، بڑے سلیقے سے وہ اپنے سفید رومال کو کس کے باندھتی تھی کہ ایک سرا ماتھے پر لٹک جاتا تھا اور یہ بہت بھلا لگتا تھا کہ سانولا سلونا مکھڑا اور اس پر سفید رومال کا پلو کھنچا ہوا

خوب پھبتا تھا۔ اور جب وہ مسکراتی تھی تو اس کی نیلگوں سیاہ آنکھیں، بادام سی آنکھیں لڑکپن کی شرارت سے چم چم کرنے لگتی تھیں اور جب وہ یک دم گانے پر آ جاتی اور شوخ چٹپٹے دیہاتی دوھے اڑاتی تو اس کی سندر انکھڑیوں میں چمک آ جاتی تھی — کمسن لڑکیوں کی سی چمک نہیں۔

اس پر اکثر میری نظر پڑی کہ ”جگیت،، لوگ یعنی کماؤ جوان، خاص طور سے وہ جو لام پر سے گھر آئے ہوئے ہوتے تھے، جمیلہ کو دیکھتے رہ جاتے تھے۔ جمیلہ کو خود بھی چھیڑ چھاڑ دل سے پسند تھی لیکن اگر کوئی زرا آگے بڑھتا تو وہ ھاتھ کے ھاتھ بندش کر دیتی تھی۔ مگر مجھے ایسے معاملے ھمیشہ ناگوار گزرتے تھے۔ ایک طرح کی جلن ہوتی تھی مجھ کو جیسے چھوٹے بھائیوں کو بہنوں کے معاملے میں ہوتی ھے اور اگر میں دیکھتا کہ نوجوان لوگ جمیلہ کے آس پاس موجود ھیں تو کسی نہ کسی ترکیب سے انہیں کاٹنے کی فکر کرتا۔ میرا منہ چڑھ جاتا اور ایسی غصیلی نظر سے انہیں دیکھتا گویا میری صورت پر لکھا ھے: ”زرا سنبھل کے، ھاں! میرے بھیا کی بیوی ھے یہ۔ کہیں یہ مت سمجھ لینا کہ اس کا حمایتی نہیں ھے کوئی!،،

میں ایسی صورتوں میں جان بوجھ کر بڑی بےتکلفی سے بات‌چیت میں موقع بےموقع ٹانگ اڑا دیتا اور ساری

کوشش اس بات کی کرتا کہ یہ لوگ جو بھابی کے چکر کاٹ رہے ھیں ان کا مذاق اڑاؤں اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تھا تو میں آپے سے باھر ھوجاتا اور اکڑتا بررتا ھوا ایک طرف کو چل دیتا۔

اس پر وہ جوان ھنسی کے مارے لوٹ پوٹ ھو جاتے تھے۔

"اوئے، زرا دیکھیو تو اسے۔ ھاں جی، کیوں نہیں۔ بھابی جو ھے ماس کی۔ کیا دل لگی ھے، واہ! ھمیں کیا خبر تھی بھلا۔"

میں خود کو گھونٹتا، صبر سے کام لیتا مگر معلوم ھوتا تھا جیسے کان بھرم کھولے دے رہے ھیں اور جل رہے ھیں۔ ذلت کے احساس سے آنکھوں میں آنسو اچھل آتے۔ اور میری بھابی جمیلہ اس حالت کو سمجھہ جاتی تھی۔ اگرچہ ھنسی پھٹی پڑتی تھی مگر بمشکل تمام اسے ضبط کرکے سنجیدہ صورت بنا لیتی۔

"کیا سمجھا ھے تم نے — کہ جینے سڑک پر پڑی پھرتی ھے؟" وہ بن کر ان لوگوں سے کہتی۔ "جاؤ، جاؤ۔ جہاں کے تم ھو وھاں ایسا ھوتا ھوگا، ھمارے یہاں کا چلن نہیں ھے یہ۔ چل میرے چھوٹے بھیا — ان سے ھمیں کیا واسطہ!" یہ کہہ کر ان لوگوں کے سامنے سے اٹھلا کر اور اکڑے گردن تانے بڑھہ جاتی اور شانے یوں اکڑا لیتی جیسے ان کو ٹھینگا

دکھا رہی ہو۔ پھر میرے ساتھ چل دیتی اور چپ چاپ مسکرانے لگتی۔

اس مسکراہٹ پر میرا جی بھی جلتا تھا اور مزا بھی آتا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنے دل میں سوچتی ہو ”تو بھی کیا بےعقل چھوکرا ہے۔ بھلا میں خود کو کسی کے حوالے کرنا چاہوں تو کون ہے جو مجھے روک لے گا؟ بھرا گھر بھی میری پاسبانی کرتا رہے تو کیا ہوتا ہے؟،، میں ایسے موقعوں پر دم سادھ لیتا تھا قصوروار کی طرح۔ ہاں واقعی مجھے جلن ہوتی تھی جمیلہ کے معاملے میں۔ دل سے میں اس کی پوجا کرتا تھا۔ اس پر اکڑتا تھا کہ یہ میری بھابی، میری جینے ہے۔ ایسی حسین، ایسی مختار اور من چلی طبیعت والی۔ میری اور بھابی کی خوب گاڑھی چھنتی تھی اور کوئی بات ہم آپس میں چھپاتے نہیں تھے۔

ان دنوں گاؤں میں مرد بہت کم رہ گئے تھے۔ اس کے کارن یہ ہو گیا تھا کہ بعض جوان لوگ عورتوں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آنے لگے تھے اور ان کے ساتھ بےالتفاتی اور ناقدری پر اتر آئے تھے: ان سے الجھنے میں کیا دھرا ہے۔ بقول شخصے، بس زرا انگلی سے اشارہ کر دو — جسے کہو دوڑی چلی آئے۔

ایک بار کیا ہوا کہ چری بھوسا کٹی پر ایک ہمارا دور کا رشتہ‌دار عثمان جمیلہ کے سر ہو گیا۔ وہ بھی ان لوگوں میں سے تھا جو سمجھتے تھے کہ ان کے

آگے کسی عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ جمیلہ نے بپھر کر اس کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا اور خود بھوسے کی ٹال سے اٹھ کھڑی ہوئی جہاں وہ سائے میں دم لینے بیٹھ گئی تھی۔

" خبردار ! "، جمیلہ نے غصے میں عثمان کو ڈانٹا اور منہ پھیر لیا۔ " ہاں اور تم سے امید بھی کیا ہو سکتی ہے، سانڈ کے سانڈ ! "

عثمان بھوسے کی ٹال میں پڑا پڑا کھسیانے پن میں اپنے گیلے ہونٹ موڑتا رہ گیا۔

" بلی کو وہ گوشت بھی نہیں بھاتا جو بہت اونچے چھینکے پر لٹکا ہو۔ سمجھی؟ بیکار میں خود کو دکھ دے رہی ہے تو۔ تیرا بھی تو دل تڑپتا ہوگا اندر سے — پھر ناک چڑھانے سے کیا نتیجہ ؟ "

جمیلہ نے تیزی سے منہ پھیرا اور بولی :

" اچھا۔ دل چاہتا ہے، تو بھی کیا ہوا ! قسمت میں یہی ہونا تھا اور تم ہو احمق۔ اوپر سے ہنستے ہو۔ سو برس سپاہی کی جورو بن کے بیٹھی رہوں گی مگر تجھ جیسے پر تھوکوں گی بھی نہیں۔ گھن آتی ہے۔ وہ تو کہو جنگ کا زمانہ ہے، نہیں تو بھلا کوئی عورت تجھے منہ لگاتی ! "

" یہی تو میں بھی کہوں۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ شوہر کی فکر ہی نہیں پڑی، تبھی جامے سے باہر ہے "

عثمان نے ناک سکیڑ کر جملہ کسا۔ ”نہ ہوئی تو میری عورت — ورنہ دوسرے سروں میں گاتی۔“

جمیلہ جیسے اس پر جھپٹنے ہی والی تھی، اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ سادھ گئی اور سمجھ لیا کہ اس آدمی سے واسطہ رکھنا بیکار ہے۔ دیر تک نفرت کی نگاہ سے اس نے عثمان کو گھورا۔ پھر زور سے آخ تھو کیا، زمین سے اپنا دنتیالا اٹھایا اور اکڑتی ہوئی چل دی۔

میں بھوسے کی ٹال کے پیچھے چھکڑے پر کھڑا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جمیلہ دوسری طرف ایک دم گھوم گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ دل کی یہ حالت تھی گویا جمیلہ کی نہیں، میری تذلیل ہوئی ہے۔ میری عزت پر حملہ کیا گیا ہے۔ دل مسوستے ہوئے میں نے اسے ڈانٹا:

”ایسوں سے واسطہ ہی کیوں رکھتی ہو؟ کیا ضرورت ہے تمہیں ایسے آدمیوں کو منہ لگانے کی؟“

اس روز رات تک جمیلہ رنج کے مارے بجھی بجھی رہی۔ آتی جاتی تھی مگر نہ تو مجھ سے کوئی بات کی اور نہ ہنسی مسکرائی پہلے کی طرح۔ جب میں نے چھکڑے کو اس کی طرف بڑھایا تو اس نے جھٹکے سے اپنا دنتیالا بھوسے کے گٹھے میں گڑو دیا اور یکبارگی سارا کا سارا اٹھا کر اپنے چہرے کے سامنے کر لیا تاکہ منہ چھپ جائے، نگاہ چار نہ ہو اور اس خوفناک زیادتی پر

کہا سنی ہونے کی نوبت نہ آئے جس کا زخم وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھی۔ وہ گٹھا اٹھا کر جلدی سے ڈالتی اور دوسرا اٹھانے کو تیار ہو جاتی۔ چھکڑا اتنے میں بھر گیا۔ جب میں وہاں سے چھکڑا لیکر چلا تو مڑ کے دیکھا کہ وہ اپنے دنتیالے کے ہتھے پر جھکی ہوئی دم بھر کو افسردہ کھڑی رہی اور کسی فکر میں ڈوبی رہی اور پھر ایک دم چونک کر اپنے کام میں جٹ گئی۔

جب ہم نے آخری چھکڑا بھر لیا تو جمیلہ گویا ساری دنیا جہان سے غافل ہو کر دیر تک ڈوبتے سورج کی سرخی دیکھتی رہی۔ دریا کے اس پار قزاخوں کے اسٹیپی میدانوں کے کہیں کنارے پر فصل کی کٹائی کی شام کا نڈھال سورج ایسا دھک رہا تھا جیسے تندور گرم ہو۔ افق کے پار سورج آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا تھا اور آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کو شفق کی سرخی سے گرم کرتا ہوا، بنفشئی رنگ کے اسٹیپی پر آخری کرنیں بکھیرتا ہوا اتر رہا تھا، نیچے گھاٹیوں میں دونوں وقت ملنے کی نیلاہٹ پھیل چلی تھی۔ ڈوبتے سورج کو جمیلہ ایسی پرسکون کیفیت میں ڈوب کر تکے جا رہی تھی گویا سورج نہیں ڈوب رہا، کوئی معجزہ ظہور میں آ رہا ہے۔ چہرے پر نرمی و لطافت کا اجالا پھیلا تھا اور ادھ کھلے ہونٹوں پر بچوں کی سی شگفتہ اور گداز مسکراہٹ کھلی تھی۔ اس عالم میں جمیلہ نے گویا میرے ان کہے اشاروں یا کچوکوں کا جواب دیتے ہوئے، جو

ابھی پوری طرح زبان سے ادا بھی نہیں ہوئے تھے، میری طرف مڑ کر ایسے لہجے میں بات کی جیسے ہم لوگوں میں بات‌چیت پہلے سے چل رہی ہو :

"کیچینے بالا، تم اس آدمی کا خیال مت کرنا۔ توبہ کرو۔ بھلا وہ بھی کوئی آدمی ہے؟.."، جمیلہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور سورج کے بجھتے ہوئے کنارے پر نظر دوڑاتی رہی۔ پھر اس نے ایک آہ سرد بھری اور سوچ میں ڈوبے ڈوبے بولی "عثمان جیسے آدمی کو بھلا کیا خبر کہ آدمی کے دل میں کیا ہے؟ کسی کو اندر کی خبر نہیں ہے... اور کیا پتہ ایسے مردوے ہوتے ہی نہ ہونگے۔"

میں اتنے گھوڑے موڑوں، جمیلہ تیزی سے لپک کر ان عورتوں تک پہنچ گئی جو ہم سے ہٹ کر ایک طرف کام پر لگی ہوئی تھیں اور ان کے زور زور ٹھٹھے لگانے کی آوازیں میرے کانوں تک آئیں۔ سمجھہ میں نہیں آتا تھا اسے ہوا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سورج ڈوبنے کے منظر سے اس کی روح باغ باغ ہو گئی ہو، ممکن ہے بس یوں ہی شاد ہو رہی ہو اس بات سے کہ کام اچھا کیا۔ میں چھکڑے میں بھوسے کی اونچی سی ڈھیری پر ڈٹا بیٹھا رہا اور وہاں سے جمیلہ کو دیکھتا رہا۔ اس نے سر پر سے سفید رومال کھینچ کر نکال لیا اور کٹے ہوئے بےنور سبزہ زار پر اپنی سہیلی کے پیچھے دونوں ہاتھہ پھیلائے بےتحاشا دوڑی۔ ہوا میں اس کا دامن زور

زور تھپ‌تھپا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے دل کا بوجھ بھی اتر گیا۔ " بھلا اس بکواسی آدمی عثمان کے بارے میں کیا سوچنا ! "

" ٹخ ٹخ — چل بیٹا "، گھوڑوں کو میں نے چابک رسید کیا اور روانہ ہو گیا۔

اس روز اپنی ٹیم کے لیڈر کے کہنے پر میں نے طے کیا کہ ابا کے آنے تک ٹھیروں اور جب وہ آجائیں تو ان سے سر پر استرا پھروا لوں۔ اور ان کے آنے تک صادق کے خط کا جواب لکھ ڈالوں۔ اس معاملے میں بھی ہمارے یہاں ایک قاعدہ مقرر تھا : بھائی خط لکھتا تو باپ کے نام لکھتا، گاؤں کا ڈاکیہ خط لا کر اماں کے حوالے کرتا اور ان خطوں کا پڑھنا ، جواب لکھنا میری ڈیوٹی تھی۔ ابھی میں نے خط پڑھنا بھی شروع نہ کیا تھا کہ سمجھ گیا صادق نے کیا لکھا ہوگا۔ اس کے خط سارے کے سارے بالکل ایک سے ہوتے تھے جیسے کسی ریوڑ میں بھیڑ کے بچے۔ صادق اپنا خط ہمیشہ اسی لفظ سے شروع کرتا : " پیام سلام "، اور اس کے بعد مستقل طور پر یہی ایک عبارت تحریر ہوتی : " میں یہ خط ڈاک سے اپنے عزیزوں کو بھیجتا ہوں جو مہکتے ہوئے اور کھلتے ہوئے تالاس علاقے میں رہتے ہیں۔ اول سلام اپنے پیارے اچھے ابا جی جولچوبائی کو ... "، ابا کو سلام لکھنے کے بعد میری اماں کو، پھر اپنی سگی ماں کو اور پھر ہم

سب کی باری آتی بہت سخت ڈکی بندھی ترتیب کے ساتھہ۔ پھر اس کے بعد قبیلے کے بڑے بوڑھوں کی اور آس پاس کے رشتہ‌داروں کی خیریت دریافت کی جاتی اور کہیں خط کے بالکل آخر میں ایسے جیسے جلدی پڑی ہو کہیں کی، یہ الفاظ لکھے ہوتے ”اچھا، میری بیوی جمیلہ کو بھی سلام پہنچے“۔

لازمی بات ہے کہ جب کسی کے ماں‌باپ زندہ ہوں اور گاؤں میں قبیلے کنبے کے بڑے بوڑھے، عزیز رشتہ‌دار موجود ہوں، اپنی بیوی کا ذکر پہلے کرنا بلکہ اس کے نام خط لکھنا نہ صرف یہ کہ نامناسب بات تھی بلکہ بدتمیزی شمار ہوتی تھی۔ ایک صادق کیا، سارے ہی خوددار جوان اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اس میں سوچنے بوجھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ گاؤں میں سبھی کا یہ چلن تھا اور اس پر رائے زنی تو کوئی کیا کرتا، ہم میں سے کسی نے کبھی اس پر دماغ تک نہیں لڑایا۔ سوچنا کا ہے کا! اور پھر یہ بھی تو ہے کہ ہر ایک خط دل کی مراد اور هنسی خوشی کا موقع لے کر آتا تھا۔

اماں کئی کئی بار خط پڑھوا کر سنتی تھیں۔ پھر وہ اس کاغذ کو اپنے سخت کھردرے ھاتھوں میں پاک پاکیزہ لگن کے ساتھہ اٹھا لیتی تھیں اور ایسے بیڈھب طریقے سے تھامتی تھیں جیسے خط کا پرزہ نہیں، کوئی چڑیا ہے جو پھرر سے اڑ جائے گی۔ مشکل سے مڑنے والی انگلیوں کو ھلاجلا کر وہ اس کاغذ کی تین تہیں کرتیں اور لپیٹ دیتیں۔

”ہائے میرے جگر کے ٹکڑو، تعویذ بنا کے رکھوں گی تمہارے خطوں کو“، وہ آنسوؤں سے لرزتی ہوئی آواز میں کہتیں۔ ”دیکھنا، کتنی فکر ہے اس کو، ابا کیسے ہیں، اماں کیسی ہیں، عزیزوں رشتہ داروں کا کیا حال ہے۔ ارے ہم کو کیا مصیبت پڑتی۔ اچھے خاصے بیٹھے ہیں اپنے گاؤں میں۔ تم پر جانے کیا گزر رہی ہو گی؟ بس دو حرف اپنی خیریت کے بھیج دیا کرو۔ یہی لکھنا بہت ہے کہ ماں، میں اچھی طرح ہوں اور کیا — ہمیں اور کچھ نہیں چاہئے۔“

اماں اسی طرح دیر تک اس تکونے خط کو تکتی رہتیں، پھر وہ اسے چمڑے کے تھیلے میں دوسرے خطوں کے ساتھ رکھ دیتیں اور صندوق میں ڈال کر تالا لگا دیتیں۔

اس بار صادق کا خط آیا تو اس پر ساراتوف کے ڈاکخانے کی مہر تھی۔ وہ ہسپتال میں پڑا تھا اور وہیں سے لکھا تھا کہ میں انشااللہ تعالی خزاں کے موسم تک گھر پہنچ جاؤنگا۔ پہلے خط میں وہ اس کی اطلاع دے چکا تھا اور ہم سب کو بہت خوشی تھی کہ دیکھئے اب ملنا ہوتا ہے۔

اس وقت صادق کا خط آیا تو جمیلہ اتفاق سے گھر پر موجود تھی۔ اسے خط پڑھنے کو دیا گیا۔ جب ہاتھوں میں یہ تکونا کاغذ اس نے اٹھایا تو میری نظر پڑی کہ اس کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ جلدی جلدی سطروں پر

بیتابی سے نظر دوڑاکر اس نے دل ہی دل میں خط پڑھہ ڈالا۔ خط کی عبارت کے آخر تک پہنچتے پہنچتے اس کے شانے ڈھلتے چلے گئے اور گالوں کی لالی بجھتے بجھتے بجھہ گئی۔ اس نے اپنی سیدھی کھنچی ھوئی بھویں تان لیں اور تحریر آخری سطروں تک پڑھے بغیر اماں کو خط واپس کر دیا۔ بے رخی کا ایسا انداز طاری تھا گویا کوئی چیز قرض لی تھی جو لوٹا دی۔

ظاھر بات تھی کہ اماں اپنی بہو کے دل کی حالت تاڑ گئیں اور انہوں نے سوچا، لاؤ اس کا جی ھلکا کر دوں۔

" کیا ھوا تجھے ؟ "، انہوں نے صندوق پر تالا ٹھونکتے ھوئے کہا۔ " بجائے اس کے کہ خوش ھوتی اور الٹی ڈوب گئی تو۔ ایک تیرا اکیلی کا میاں تھوڑئی ھے فوج میں۔ مصیبت تجھی پر نہیں پڑی ھے۔ اور سب لوگ بھی دکھی ھیں۔ سبھوں کے ساتھہ اپنا دکھہ بھی سہہ لے۔ یہ مت سمجھنا کہ اوروں کو دکھہ ھی نہیں ھوتا۔ اوروں کو اپنے اپنے میاں کے چھوٹنے کا ملال نہیں ھے۔ سب کو ھے... دل تو دکھے گا ھی لیکن ظاھر مت کر۔ اندر ھی اندر پی جا! "

جمیلہ نے زبان سے کچھہ نہ کہا مگر اس کی ٹھنکتی ھوئی، بسورتی ھوئی صورت صاف کہہ رھی تھی " ھاں، اماں، تم کسی کے دل کا حال کیا سمجھو ! "

بہرحال اس روز میں گھر پر نہیں ٹھیرا۔ گاڑی لیکر نکل گیا اور گاھن پر پہنچا۔ رات کو میں وھیں

رھا کرتا تھا۔ گھوڑے کھول کر لوسرن کے کھیت میں چرنے چھوڑ دیتا اور ان کی پچھاڑی باندھ دیتا۔ کالخوز کے مکھیا کی اجازت نہیں تھی کہ جانور لوسرن کے کھیت میں چھوڑا جائے۔ لیکن اپنے گھوڑوں کو خوب تیار رکھنے کے لئے میں قاعدے کی خلاف‌ورزی کیا کرتا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ نشیب میں ایک الگ سی جگہ ہے اور پھر رات کے اندھیرے میں کسی کو کیا خبر ھوتی۔ اب کی بار جو میں نے گھوڑے کھول کر اس طرف ھنکائے تو دیکھتا کیا ھوں کہ کسی اور نے پہلے سے چار گھوڑے چرنے چھوڑ رکھے ھیں۔ یہ حرکت مجھے سخت ناگوار گزری۔ کیا معنی کہ ایک جوڑی کی گاڑی کا مالک تھا میں اور مجھے پورا حق تھا غصے ھونے کا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، جی میں ٹھان لی کہ ان چاروں گھوڑوں کو یہاں سے کہیں دور کھدیڑ دوں تاکہ اس پاجی آدمی کو ایک سبق دے دیا جائے جس نے میرے علاقے میں دخل اندازی کی تھی۔ لیکن اتنے میں پہچانا کہ ایک جوڑی تو ان میں دانیار کی تھی۔ وھی آدمی جس کے متعلق ھماری ٹیم کا لیڈر دن میں کہہ چکا تھا۔ اور اس خیال سے کہ آج کے بعد ھم اور وہ ساتھ اسٹیشن اناج ڈھویا کریں گے، میں نے اس کی جوڑی کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور وھاں سے چپ‌چاپ گاھن کو واپس آگیا۔

دانیار وہاں موجود تھا۔ ابھی ابھی گاڑی کے پہیوں کو تیل دے کے نمٹا تھا۔ اور اب دھرے پر ڈھبری کس رہا تھا۔

" دانیار، کیوں یہ تمہارے گھوڑے چھوٹے ہوئے ہیں نشیب میں؟ " میں نے دریافت کیا۔

آہستہ سے اس نے اپنا سر گھمایا۔

" دو ہیں میرے۔ "

" اور باقی جوڑی ؟ "

" وہ، کیا نام اس کا، جمیلہ کے ہیں۔ تمہاری کچھ لگتی تو ہے وہ — بھابی تمہاری ؟ "

" ہاں۔ جینے، بھابی۔ "

" ٹیم کے لیڈر نے خود یہ گھوڑے وہاں چھوڑے ہیں اور مجھ سے کہہ گیا ہے نظر رکھنے کو۔ "

اچھا ہی ہوا کہ میں نے انہیں کھدیڑا نہیں وہاں سے !

رات ہو گئی۔ اور پہاڑوں کی طرف سے ہوا کے جھونکے دھیمے پڑ گئے۔ گاہنے کی جگہ پر بھی خاموشی چھا گئی۔ دانیار نے میرے پاس ہی ٹانگیں پسار دیں اور بھوسے کی ٹال میں پڑ رہا۔ لیکن ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہ اٹھ بیٹھا اور دریا کی طرف چل دیا۔ کھڈ کے کنارے پہنچ کر وہ ٹھیر گیا اور یوں ہی کھڑا رہا۔ ہاتھ کمر پر بندھے ہوئے تھے، سر ایک طرف کاندھے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔

ھلکی چھٹکی ہوئی چاندنی میں اس کا لمبا تڑنگا اور بے ڈول بدن ایسا ابھرا نظر آتا تھا جیسے تراشا ہوا ہو۔ لگ رہا تھا کہ وہ دریا کی روانی کو خوب کان لگا کر سن رہا ہے جو رات کے سناٹے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ رات کی کچھ ایسی آوازیں، کچھ ایسی سن گن بھی اس کے کان میں پڑ رہی ہو جو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ '' پھر اسے وہی سوجھی دریا پر رات گزارنے کی ا عجیب ہونق ہے ا ،، مجھے ہنسی آئی۔

دانیار کو ہمارے گاؤں میں نمودار ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ یاد پڑتا ہے کہ بھوسا کٹی پر ایک لڑکا بھاگا بھاگا آیا اور بولا '' گاؤں میں کوئی زخمی سپاہی آیا ہے۔ ،، کون ہے، کہاں کا ہے — یہ اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اوف، کیا ہنگامہ ہوتا ہے ایسے میں۔ گاؤں میں اگر کبھی کوئی لام پر سے واپس آتا تو بچے بوڑھے سب کے سب دوڑے ہوئے جاتے، اسے گھیر لیتے، ھاتھ تھام تھام کے سلام کرتے، پوچھ گچھ سے اس کا ناک میں دم کر دیتے۔ کیوں بھائی، ہمارے کسی رشتہ‌دار کو تو نہیں دیکھا، کوئی خیر خبر ہے ان کی؟ ایسی چیخ پکار مچتی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ ہر ایک کا قیاس کہتا ہمارا بھائی بھی گھر آئے گا، ہمارا داماد بھی لوٹے گا۔ جو لوگ گھاس کاٹ رہے تھے لپکتے جھپکتے دوڑے کہ دیکھیں کیا قصہ ہے۔

دانیار کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اصل نسل سے ہمارے گاؤں کا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ بچہ تھا جو یتیم ہو گیا۔ کوئی تین سال تک تو دربدر بھٹکتا رہا۔ پھر چقماق اسٹیپی کے قزاخوں میں جا رہا۔ ماں کی طرف سے اس کی قزاخوں سے رشتہ‌داری بھی تھی۔ نزدیک کے ایسے کوئی رشتہ‌دار تھے نہیں جو چھوکرے کو واپس بلاتے۔ لوگ اسے بھول بھال گئے۔ جب گاؤں والوں‌نے پوچھا، کیوں بھئی، وطن سے بےوطن ہونے کے بعد تم پر کیسی بیتی تو وہ کچھ ٹال سا گیا۔ بات صاف تھی کہ اس نے زندگی کے کڑوے گھونٹ گلے سے اتارے ہیں اور یتیمی کے دھکے بری طرح کھائے ہیں۔ زندگی نے رستے کے روڑے کی طرح اسے دور دور کی ٹھوکریں کھلائی تھیں۔ ایک زمانے تک تو وہ چقماق کی کھاری دلدلوں میں بھیڑ بکری چراتا پھرا۔ جب زرا سیانا ہو گیا تو ریگستانوں میں نہر کھودنے کے کام پر لگ گیا۔ کپاس کے نئے سرکاری فارموں پر مزدوری کرتا رہا۔ پھر کان آہنگران میں تاشقند کے نزدیک ملازم رہا اور وہیں سے فوج میں بھرتی ہوکر چلا گیا۔

اپنے آبائی گاؤں میں دانیار کی واپسی کو لوگوں نے پسند کیا۔ ”کتنا بھی وہ دوردراز کی زمینوں میں بھٹکتا پھرا ہو مگر دیکھو لوٹ کے پھر آیا، جانو، اس کی قسمت میں لکھا تھا اپنے گاؤں کی عریق کا پانی پینا۔ اور ہاں اپنے یہاں کی زبان بھی نہیں بھولا۔ زرا زرا

قزاخوں کی بانی ملا دیتا ہے۔ مگر کیا ہے جی، صاف ستھرا تو بولتا ہے؟ ،،

” تلپار * ساری دھرتی پھرے گا اور اپنا پا کھا ڈھونڈ لے گا۔ اپنی جنم بھومی اور اپنے والے کسے پیارے نہیں ہوتے۔ شاباش ہے اس کو کہ پھرپھرا کر اپنے گاؤں آ لیا، ہم تجھه سے خوش اور تیرے باپ دادا کی آتما تجھه سے خوش۔ اللہ کے فضل سے یہ ہونے والا ہے۔ جرمن کا خاتمہ، امن چین کی زندگی۔ اور تو بھی، دوسروں کی طرح بیٹے شادی وادی کرلے، گھر بسالے، تیرے چولھے سے بھی دھواں نکلے گا ،،۔ بڑے بوڑھوں نے دانیار کو تھپکی دی۔

دانیار کے بزرگوں کو یاد کرکے انھوں نے اتہ پتہ نکال لیا کہ یہ فلاں گھر کا بیٹا ہے اور اس طرح سے ہمارے گاؤں میں یہ ” نیا رشتہ‌دار ،، آبراجا د

آخر ایک روز اورعظمت اس فوجی کو بھوسے کٹی پر لئے ہوئے آیا۔ فوجی لمبا تڑنگا اور جھکے ہوئے کاندھوں کا جوان تھا جس کا بایاں پاؤں زرا لنگڑاتا تھا۔ کاندھوں پر فوجی کوٹ ڈالے ہوئے دانیار جلدی جلدی چل رہا تھا تاکہ چلنے میں پوقدمے اورعظمت سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اور خود ہماری ٹیم کا یہ لیڈر پستہ‌قد اور دبا دبا ہونے کی وجہ سے اس لمبے قدآور فوجی کے ساتھه چلتا تھا تو دریا

---

* قصے کہانیوں کا گھوڑا۔

کا بےچین چھا یاد آتا تھا۔ لڑکوں کو تو بلکہ اس پر ہنسی آگئی۔

دانیار کی زخمی ٹانگ ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی اور گھٹنے پر سے مڑتی نہیں تھی۔ اس لئے گھاس کی کٹائی میں ہاتھ نہیں بٹا سکتا تھا۔ چنانچہ ہم لڑکوں کے ساتھ چری بھوسا کاٹنے والی مشین پر لگا دیا گیا۔ سچ بات ہے کہ ہمیں یہ آدمی کچھ جچا نہیں۔ اول تو یہی کہ اس کا چپ چپ رہنا ہمارے دلوں کو نہیں بھایا، وہ بہت کم زبان کھولتا تھا۔ اور بولتا بھی تو ہمارا دل یہ کہتا کہ دانیار اس وقت زبان سے جو کہہ رہا ہے وہ نہیں سوچ رہا اور اس کے جی میں کوئی اور ہی بات ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شخص ہمیں دیکھ بھی رہا ہے یا نہیں اگرچہ وہ اپنی خواب و خیال میں ڈوبی آنکھوں سے بالکل روبرو دیکھتا ہوتا تھا۔

”بچارا نوجوان، دیکھو تو، لڑائی پر سے آکے ابھی تک سنبھلا نہیں ہے!“، لوگ اس کے بارے میں کہا کرتے تھے۔

لیکن دلچسپ بات کیا تھی کہ اپنی ایسی مستقل فکرمندی کے باوجود دانیار کام میں بہت چست، پھرتیلا اور نپاتلا تھا۔ اور اگر ہٹ کر دیکھو تو یہ خیال گزرتا تھا کہ آدمی ملنسار ہے اور بےتکلف ہے۔ ممکن ہے بچپن میں جو بےسہارا یتیمی کا زمانہ گزرا اسی نے

دانیار کو اپنے دل کی بات، اپنا خیال چھپائے رکھنے، دبائے رکھنے کی عادت ڈال دی ہو اور ایسا لئے دئے رہنا سکھا دیا ہو۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔

اس کے پتلے پتلے ہونٹ جن میں دہانے کے دونوں طرف سخت جھریاں تھیں، ہمیشہ بھنچے رہتے تھے۔ آنکھیں غمزدہ اور چپ چپ تھیں۔ لے دے کے بس تھرکتی ہوئی بھویں تھیں جن کی بدولت اس کے سنتے ہوئے اور ہمیشہ تھکے تھکے چہرے پر زندگی کے آثار پیدا ہوتے تھے۔ بعض اوقات یہ ہوتا تھا کہ ایک دم اس کے کان کھڑے ہو جاتے جیسے کوئی ایسی بات سن رہا ہو جو ہم تک نہیں پہنچ رہی۔ ایسے میں بھویں تن جاتیں اور آنکھیں کسی ایسی چیز سے تپنے لگتیں جو ہماری سمجھ سے باہر تھی۔ بعد میں دیر تک چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ ہمیں یہ ساری حرکتیں بڑی عجیب لگتی تھیں۔ اور بھی دوسروں سے نرالی باتیں تھیں دانیار میں۔ شام ہوتے ہم لوگ گھوڑوں کے ساز اتار لیتے، انہیں کھلا چھوڑ دیتے۔ جھونپڑی کے پاس اکٹھے ہو جاتے اور انتظار رہتا کہ باورچن اب کھانا تیار کرے گی۔ اس وقت دانیار اس ٹیلے پر چلا جاتا جہاں سے دور تک دیکھا جاتا ہے اور اندھیرا ہونے تک وہیں بیٹھا رہتا۔

"یہ آدمی وہاں کیا کرتا رہتا ہے۔ کسی نے پہرے پر بٹھایا ہے کیا؟" ہم لوگ اس پر ہنستے۔

ایک بار مجھے جو کرید لگی تو دانیار کے پیچھے

پیچھے ٹیلے کی طرف چل دیا۔ دیکھا کہ یہاں کچھ بھی خاص بات نہیں تھی۔ پہاڑی دامن کے اسٹیپی میدان دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور جھٹپٹے کے کاسنی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سیاہی مائل دھندلے کھیت معلوم ہوتا تھا کہ دھیرے دھیرے خاموشی میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔

دانیار نے میرے آنے پر توجہ تک نہ کی۔ وہ اپنے گھٹنے بازوؤں میں لئے بیٹھا رہا اور کہیں بہت دور دیکھتا رہا۔ مجھے پھر یہی لگا کہ بعض آوازیں ہیں کسی قسم کی، جو وہ پورے غور سے سن رہا ہے اور میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہیں۔ زرا زرا دیر میں وہ چونک اٹھتا اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگتا۔ اسے کوئی نہ کوئی بات تنگ کئے جا رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ بس اب وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اٹھ کر اپنی روح کو بےنقاب کیا — میرے سامنے نہیں، مجھے تو اس نے کچھ شمار ہی نہیں کیا، بلکہ کسی بہت بڑی ہستی کے سامنے جو میری سمجھ اور میری گرفت دونوں سے باہر ہے۔ پھر جو نظر بھر کے دیکھتا ہوں تو دانیار پہچان میں نہیں آتا : تھکا ہارا اور بجھا ہوا ایک آدمی بیٹھا ہے جیسے دن بھر کے کام سے تھک کر آرام کرنے بیٹھ گیا ہو۔

ہمارے کالخوز کی چارے کی کھیتیاں دور دور تک دریائے کورکوریو کے کنارے کنارے بکھری ہوئی

ھیں۔ یہ دریا ھمارے گاؤں کے نزدیک گھاٹی سے ابل پڑتا ھے اور وادی میں ایسا دیوانہوار گرتا ھے کہ معلوم ھوتا ھے روکے نہیں رکےگا۔ جب کھیت سے گھاس سمیٹی جاتی ھے، وھی دن پہاڑی نالوں اور دریاؤں میں سیلاب کے ھوتے ھیں۔ شام ھوتے گدلا اور جھاگ دیتا ھوا پانی اونچا ھونا شروع ھوتا ھے۔ آدھی رات گئے دریا کی زبردست باڑ کے شور سے آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا ھوں کہ نیلی پرسکون رات تاروں کی آنکھوں سے وادی کو تک رھی ھے۔ ٹھنڈی ھوا کے جھونکے زور زور چل رھے ھیں۔ زمین سو رھی ھے اور لگتا ھے کہ سرشور دریا ھمیں گھیر کر حملہآور ھو گیا ھے۔ اگرچہ ھم لوگ دریا کنارے سے کافی فاصلے پر تھے پھر بھی پانی کے سنسنانے کی آواز مجھے صاف محسوس ھوتی تھی۔ ایک دم یہ خوف چڑھتا کہ کوئی دم جاتا ھے اور ھماری جھونپڑی اپنی جگہ سے اکھڑ جائےگی اور پانی اسے بہا لے جائےگا۔ میرے ساتھ کے لوگ کٹائی کرنے والوں کی گہری نیند سو رھے ھوتے مگر کیا مجال جو میری آنکھ لگ جائے اور میں باھر نکل جاتا۔

کورکوریو دریا میں جب باڑھ آتی ھے تو وہ رات خوبصورت بھی ھوتی ھے اور خوفناک بھی۔ یہاں وھاں پچھاڑی بندھے ھوئے گھوڑوں کے سائے چراگہ میں نظر آتے ھیں۔ انہوں نے خوب جی بھر کے ھری ھری اوس میں بھیگی گھاس چرلی اور اب تھک کے آرام سے اونگھ

رہے ہیں اور ہلکے خراٹے جاری ہیں۔ ان کے پاس ہی کورکوریو دریا کناروں پر چڑھائی کرتا، اچھلتا، کانٹوں‌دار اور گیلی جھاڑیوں کو توڑتا مروڑتا اٹھہ رہا ہے اور اس زور زور سے پتھر لڑھکا رہا ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ بے کل دریا رات کو اپنی گرج اور بےپناہ شور سے بھر دیتا ہے۔ کیسا ہول چڑھتا ہے، اف توبہ !

اس قسم کی راتوں میں ہمیشہ مجھے دانیار کا خیال آتا۔ اور وہ اپنے معمول سے بالکل ہی دریا کنارے گھاس کی ڈھیریوں پر سویا کرتا تھا۔ کیا واقعی اس کا دل نہیں دھلتا تھا ؟ دریا کے شور سے اس کے کان نہیں پھٹتے تھے؟ سوتا بھی تھا یا نہیں ؟ اور پھر دریا پر اکیلے سوتا ہی کیوں ہے؟ اس سے کیا ملتا ہے ؟ عجیب آدمی ہے۔ ساری دنیا سے نرالا۔ اب اس وقت کہاں ہوگا ؟ ادھر دیکھا، ادھر دیکھا — کہیں نظر نہیں آتا۔ دریا کے کنارے بہت دور تک ہٹ گئے اور اندھیرے میں پہاڑی سلسلہ سر اٹھائے کھڑا رہ گیا۔ چوٹیوں پر سناٹا تھا اور ستارے ٹنکے تھے۔

لگتا تھا کہ اب تک دانیار نے گاؤں میں اپنے دوست احباب بنا لئے ہوں گے۔ لیکن نہیں، وہ ابھی تک سبھوں سے الگ تھلگ تھا جیسے اس کے نزدیک دوستی اور دشمنی، ہمدردی اور نفرت کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے تھے۔ قاعدے کی بات ہے کہ گاؤں میں جگیت وہی ہے

جو اپنی طرف سے اور دوسروں کی طرف سے خم ٹھونک کر کھڑا ہو سکے، جس میں اتنا دم ہو کہ کسی کا کچھ بنا سکے اور ضرورت ہو تو بگاڑ سکے، بڑے بوڑھوں سے پیچھے نہ رہے اور خوشی میں، غمی میں، رتجگے میں انتظام کی باگ ڈور سنبھال سکے، ایسے آدمی پر عورتوں کی خاص طور سے نظر پڑتی ہے۔

لیکن اگر آدمی دانیار کی طرح کا ہو، کہ دوسروں سے کٹا کٹا رہے، گاؤں کی روزمرہ کی زندگی میں ہاتھ نہ سانے تو کچھ لوگ اس کی طرف نظر اٹھا کے دیکھیں گے اور کچھ حقارت سے کہیں گے :

" یہ بھی کیا آدمی ہے، نہ کسی کو نقصان، نہ نفع۔ جی رہا ہے جیسے تیسے۔ چلو، وہ جانے اس کا کام... "

زمانے کا دستور ہے کہ اس طرح کا آدمی یا تو دوسروں کے ہنسی مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے یا لوگ ترس کھانے لگتے ہیں۔ ہم نئی نئی عمر کے چھوکرے، جن کو ہمیشہ یہ لگی رہتی تھی کہ اپنی اصلی عمر سے زیادہ بڑے نظر آئیں اور سچ مچ کے جگیتوں کے برابر سرابر سمجھے جائیں، اگر منہ پر نہیں تو پیٹھ پیچھے آپس میں ضرور دانیار کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور تو اور ہمیں اس پر بھی ہنسی چھوٹتی تھی کہ وہ اپنی فوجی قمیص خود ہی دریا پر جا کر دھوتا تھا۔ قمیص دھو کر وہیں

گیلی کی گیلی پہن لیتا کیونکہ اور کوئی قمیص نہیں تھی اس کے پاس۔

عجیب معاملہ تھا۔ دانیار دیکھنے میں تو بےزبان اور مسکین تھا مگر ہماری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس سے بےتکلفی کا برتاؤ کرلیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ عمر میں ہم سے بڑا تھا۔ بھلا تین چار برس کی چھٹ بڑائی بھی کیا۔ ایسوں سے تو ہم توتڑاق کر لیا کرتے تھے۔ اور اس لئے بھی نہیں کہ وہ چپ چپ اور خود کو تانے رہتا تھا جس کی وجہ سے آدمی کا لحاظ بنا رہتا ہے۔ نہیں وجہ کچھ اور تھی۔ اس کی خاموش اور دکھی ادھیڑپن میں کوئی اسرار تھا جس تک ہماری عقل نہیں پہنچ پاتی تھی۔ اور ہم لوگ، کہ جسے چاہتے چٹکیوں میں اڑا دیتے، اسی بات سے زرا بچکے رہتے تھے۔

ممکن ہے اس کے معاملے میں ہمارا یہ سنبھل کر رہنا ایک خاص واقعے کی وجہ سے ہو۔ میں بہت جھکی اور مراقی لڑکا تھا۔ آدمی کو سوالوں کی بوچھار سے تنگ کر دیا کرتا تھا۔ ہمیشہ بےکلی لگی رہتی تھی کہ جو لوگ فوجی رہ چکے ہیں ان سے جنگ کے بارے میں پوچھ کچھ کی جائے۔ جب دانیار آیا تو میں موقعے کی تاک میں رہتا تھا کہ فوج میں رہا ہے، اس سے کچھ سنا جائے۔

ایک بار ہم شام کے قریب کام ختم کرکے آرام سے الاؤ کے پاس بیٹھے تھے۔ کھانا کھا لیا تھا۔ فرصت تھی۔

" دانیار بھئی، کچھ جنگ کے بارے میں کہئے، سنائیے آنکھ لگنے سے پہلے "، میں نے کہا۔

دانیار پہلے تو چپ ہی رہا۔ بلکہ ایسے جیسے ہماری بات بری لگی ہو۔ دیر تک الاؤ کو تکتا رہا، پھر گردن اٹھا کر ہم سب پر نظر ڈالی۔

" جنگ کے بارے میں کیا کہوں ؟ "، اس نے سوال کیا اور پھر گویا خود اپنے ذہنی خلجان کو جواب دیتے ہوئے اس طرح بولا کہ بمشکل سنائی دیا " نہیں، اچھا یہی ہے کہ جنگ کے بارے میں مت پوچھو ! "

اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ کولی بھر کے ایندھن لیا، آگ میں جھونکا اور ہماری طرف نگاہ اٹھائے بغیر آ گ میں پھونکیں مارتا رہا۔

دانیار نے اس ایک جملے کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن اس سے ہمیں پورا احساس ہوگیا کہ جنگ کے بارے میں یوں ادھر ادھر کی بات نہیں کرنی چاہئے اور یہ ایسا قصہ کہانی نہیں ہے جسے سنتے سنتے آدمی سوجائے۔ انسان کے دل کی تہہ میں جنگ نے خون کھولا دیا ہے اور اب اسے قصہ کہانی کے طور پر بیان کرنا مشکل ہے۔ خود اپنے آپ سے مجھے شرم آئی۔ پھر اس کے بعد جنگ کے بارے میں کوئی سوال میں نے نہیں کیا۔

صرف یہی ایک واقعہ نہیں تھا جس سے اس کی عزت ہمارے دلوں میں بیٹھہ گئی ہو۔ وہ شام آئی گئی ہوئی جیسے خود دانیار کو ھی کڑوں والے بھول بھال گئے۔ لوگوں سے اس کا کترایا رھنا، منہ سئے رھنا ایسی عادتیں تھیں جن سے لوگ یا تو بےرخی برتنے لگے یا ترس کھانے لگے۔

" ھا — بچارا، بے گھر، بے در "، لوگوں کی زبان پر یوں اس کا تذکرہ آتا۔ " غنیمت ھے پھر بھی کہ کالخوز میں کھانا کھا لیتا ھے۔ نہیں تو آدمی بھیک مانگتا پھرے۔ کیا چپ‌چپ سا جوان ھے۔ بالکل مسکین — بھیڑ کی طرح ! "

رفتہ رفتہ لوگوں کو دانیار کے عجیب وغریب مزاج کی عادت ھو گئی۔ اور انہوں نے ادھر دھیان دینا ھی چھوڑ دیا۔ اور ھونا بھی کیا تھا۔ آدمی جب خود ھی کنارہ کشی پر آجائے تو لوگ بھی اس کو بھول بھال جاتے ھیں۔

دوسرے دن کا ذکر ھے۔ ھم سب صبح تڑکے سے دانیار کے ساتھہ اپنے گھوڑے لے کر گاڑھنے کے ٹھکانے پر آگئے۔ عین اسی وقت جمیلہ بھی پہنچی۔ ھمیں دیکھتے ھی وہ بہت دور سے پکاری :

" اوئی کیچینے بالا میرے گھوڑے ادھر ھانک دینا رے ! میرے گھوڑوں کی جوڑی کا ساز کہاں گیا ؟ "

وہ چھکڑے کو یوں دل‌چسپی کے ساتھہ دیکھنے بھالنے لگی جیسے زندگی بھر گاڑی‌بانی کرتی رھی ھو۔ پہیوں

کو ٹھوکروں سے ٹھونک ٹھونک کر دیکھتی تھی کہ دھرا ٹھیک بیٹھا ہے یا نہیں۔

جب ہم دانیار کے ساتھہ آگے بڑھے اور اس کے قریب گئے تو، حلیے سے بےڈھنگے لگ رہے تھے۔ دانیار کی لمبی لمبی سوکھی ماری ٹانگیں یہ بڑے بڑے جوتوں میں کھڑبڑا رہی تھیں اور جوتے تھے کہ اب پھسلے، تب پھسلے۔ اور میں اپنی گندی غلیظ ایڑیوں سے ایڑ دے دے کر گھوڑے کو آگے بڑھا رہا تھا۔

" واہ کیا جوڑ ہے ! "، جمیلہ نے مزے میں سر ہلا کر کہا۔ اور پھر فوراً ہم پر حکم چلانے لگی۔ " زرا جاندار چال سے چلو، دھوپ تیز ہونے سے پہلے اسٹیپی سے نکل جانا ہے ! "

اس نے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں، انہیں چھکڑے کے پاس لے گئی اور جوتنا شروع کر دیا۔ خود ھی گھوڑے جوت لئے اور صرف ایک بار مجھہ سے پوچھنا پڑا کہ راس کیسے درست کی جاتی ہے۔ دانیار کی طرف دھیان تک نہ دیا گویا وھاں کہیں اس کا وجود ھی نہیں ہے۔

جمیلہ کے اس اکھڑپن سے بلکہ دوسروں کو اکھر جانے والی خوداعتمادی سے دانیار سناٹے میں آ گیا۔ وہ کھڑے کھڑے اس انداز سے اسے دیکھتا رہا جس میں اگرچہ تعلق خاطر نہیں معلوم ہوتا تھا پھر بھی دل سے تعریف نکل رہی تھی اور ہونٹ بھینچے ہوئے

تھے۔ اس نے تول پر سے اناج کی بوری اٹھائی اور جمیلہ کے چھکڑے پر چڑھانے لایا تو وہ اس پر برس پڑی :

” یہ کیا حرکت ہے؟ جس کے جو جی میں آئے گا کرے گا ؟ نہیں جی، یوں نہیں چلنے والا۔ اچھا لاؤ ہاتھ دو ! اور تم کیا منہ دیکھ رہے ہو کیچینے بالا، گاڑی پر آجاؤ، بوری کو ٹھکانے لگواؤ ! ،،

جمیلہ نے دانیار کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما۔ اور جب ان دونوں نے ایک ساتھ بازوؤں کو ملا کر اناج کی بوری پکڑوائی تو وہ بچارا جھینپ گیا اور منہ پر سرخی دوڑ گئی۔ پھر ایک کے بعد دوسری بوری ، ہر بار دونوں ایک دوسرے کی کلائی مضبوطی سے تھام کر چھکڑے پر بوری چڑھواتے، سر سے سر قریب مل جاتے تو مجھے صاف نظر آتا کہ دانیار گھبراہٹ اور شرم کے مارے پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ باربار اپنے ہونٹ چباتا ہے اور جمیلہ سے آنکھیں چار کرنے میں کنی کاٹ جاتا ہے۔ مگر اس پر زرا بھی اثر نہیں تھا۔ وہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طرف سے بالکل ہی بےپروا ہے اور تول والی عورت سے چھیڑ چھاڑ کئے جا رہی تھی۔ جب گاڑیوں کا بھار ہو چکا اور ہم نے راس اٹھائی تو جمیلہ نے شرارت سے آنکھ مار کر دانیار کو چھیڑا اور مسکرائی :

'' ارے، اے کیا نام تیرا ؟ دانیار — ہے نا ؟ دیکھنے میں خاصا مردوا معلوم ہوتا ہے۔ چل تو ہی اگاڑی ہو لے ! ''

دانیار زبان سے کچھ نہ بولا اور گاڑی اپنی جگہ سے بڑھا دی۔

'' ہائے غریب، کس آفت میں پھنسا ہے اور پھر اوپر سے شرمائے جاتا ہے ''، میں نے اپنے جی میں سوچا۔

راستہ کافی لمبا تھا — اسٹیپی میدان کے کوئی بیس کلومیٹر اور پھر گھاٹی میں سے ہوکر اسٹیشن پہنچنا تھا۔ ایک ہی سہولت تھی اس راستے کی کہ یہاں سے وہاں تک برابر ڈھلان چلی گئی تھی اور اترائی میں گھوڑے آسانی سے اڑے چلے جاتے تھے۔

ہمارا گاؤں کورکوریو دریا کے کنارے آباد تھا، ''بڑے پہاڑ'' کی ڈھلان پر، اور ''کالے پہاڑ'' تک اس کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ گھاٹی میں پہنچنے تک گاؤں نظر آتا رہتا ہے کیونکہ گاؤں کے درختوں کی کالی جیسی پھننگیں دور تک نظر میں رہتی ہیں۔

دن میں گاؤں سے اسٹیشن ایک پھیرا ہوتا تھا۔ صبح تڑکے ہم نکلتے اور تیسرے پہر کے قریب منزل پر پہنچ جاتے۔

دھوپ کڑی تھی اور اسٹیشن پر وہ دھکم دھکا کہ گاڑی تیزی سے بڑھانا مشکل۔ گاڑیاں، چھکڑے، بوروں سے اوپر تک لدے ہوئے وادی کے ہر طرف سے یورش

کر رہے تھے۔ خچر اور بیل لدے پھندے دور دور کے پنچائتی فارموں سے آ رہے تھے۔ ان کو ہنکانے والے کون؟ لڑکے بالے اور فوجیوں کی بہویں اور بیویاں دھوپ سے سنولائی ہوئی، رنگ اترے کپڑے پہنے، پتھریلے راستوں پر ننگے پاؤں چلنے سے کھال ادھڑی ہوئی، ایڑیاں پھٹی ہوئی، دھوپ کی شدت سے، غبار کی کثرت سے ہونٹ پھٹ کے لہو پھوٹ پڑا تھا۔

اناج کی کھتیوں کے پھاٹک پر دونوں تھمبوں کے درمیان لکھا تھا: "اناج کی ایک ایک بالی میدان جنگ کو!" احاطے میں گاڑی والوں کی دھکم دھکا اور شور پکار۔ پاس ہی ایک نیچی دیوار کے پیچھے ریل کا ایک انجن گرم گرم بھاپ کے موٹے بھپکے مارتا، جلے ہوئے کھنگر کی سی بو دیتا ہوا ادھر سے ادھر شنٹنگ کر رہا تھا۔ احاطے کے نزدیک ریل گاڑیوں کے شور سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اونٹ ایسے جم کر بیٹھے تھے کہ رال بھرا منہ پھاڑتے، غصے سے دھاڑتے بلبلاتے اور زمین سے اٹھنے کا نام نہ لیتے۔

لوہے کے تپتے ہوئے ایک سائبان کے نیچے اناج کی بوریوں کے ٹیلے لگ گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ اب جو بوریاں آئی ہیں انہیں اتار اتار کر تختوں پر سے ہوتے ہوئے اس سائبان کے نیچے لگایا جائے۔ ہوا اناج کی بو سے بھاری ہو گئی تھی اور گرد و غبار اتنا اٹ گیا تھا کہ سانس لینا مشکل تھا۔

”اے چھوکرے، زرا دیکھه ادھر میری طرف!“
نیچے سے مال وصول کرنےوالے منشی نے چیخ کر کہا۔ اس کی آنکھیں نیند نہ بھرنے سے لال ہو رہی تھیں۔ ”اوپر، اوپر، سب سے اوپر لگا دے بوری!“، گھونسا تان کر وہ گرجا اور ڈانٹ پھٹکار کرتا رہا۔

یہ ڈانٹ ڈپٹ کیوں کرتا ہے؟ ہمیں خود معلوم ہے بوری کہاں لگانی ہے، کہاں نہیں۔ لگا دیں گے۔ آخر ہم ہی تو یہ بوریاں ان کھیتوں سے ڈھوڈھو کر لائے ہیں جہاں عورتیں، بوڑھے، بچے سب نے مل کر گیہوں بویا، کاٹا اور اب کہ کٹائی زوروں پر ہے، اناج اٹھانے، صاف کرنے کی مشین کا مستری کب سے جھینک رہا ہے، مشین تھکی ہوئی ہے، کام نہیں کرتی مگر اسی سے زور لگا رہا ہے۔ عورتیں درانتیاں لئے صبح سے شام تک اپنی کمر توڑتی رہتی ہیں، درانتیاں جلتی رہتی ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے بچے اناج کی ایک ایک بالی بڑی احتیاط سے چنتے پھرتے ہیں۔

اب بھی مجھے یاد ہے کہ جو بوریاں میں نے خود اپنے کاندھوں پر لادلاد کر چڑھائی اتاری ہیں، کس قدر بھاری تھیں۔ ایسا کڑا کام کسی مضبوط آدمی کے کرنے کا تھا۔ بوریاں لادے سنبھل سنبھل کر میں اوپر کی طرف بڑھا۔ پیروں کے نیچے تختے چرچرا رہے تھے، جھونک کھا رہے تھے۔ بوری کا ایک کونا مضبوطی سے دانتوں میں داب رکھا تھا تاکہ بوجھه

کمر پر سنبھالے رہوں، کھسک نہ جائے۔ گردوغبار سے گلا گھٹا جا رہا تھا۔ پسلیاں بوجھ کے مارے چٹخی جا رہی تھیں اور آنکھوں کے آگے چنگاریاں اڑنے لگی تھیں۔ کتنی بار تو یہ ہوا کہ آدھے راستے میں ہمت جواب دے گئی۔ لگا کہ کمر پر سے بوری اب کھسکی، اب کھسکی۔ جی چاھا اسے بھی پٹک دوں اور خود بھی اس کے پیچھے لڑھک جاؤں۔ مگر میرے پیچھے اور لوگ بھی چل رہے تھے کمر پر بوریاں لادے ہوئے، میرے ساتھ کے چھوکرے بھی اور فوجیوں کی عورتیں جن کے میرے برابر کی اولاد تھی۔ جنگ کا زمانہ اگر نہ ھوتا تو بھلا ان کو اس مصیبت میں کون ڈالنے والا تھا۔ نہیں، میں پیچھے نہیں ھٹوں گا جب عورتیں تک یہ کام کر رہی ھیں تو مجھے کیا حق چھوڑ دینے کا!

یہ لو جمیلہ آگے آگے چلی جا رہی ھے کرتہ گھٹنوں کے اوپر تک چڑھائے ھوئے۔ دیکھتا ھوں تو اس کی سانولی خوب صورت پنڈلیوں پر مچھلیاں تڑپ رہی ھیں۔ اور بھاری بھرکم بوری کے بوجھ تلے لچکتے ھوئے بدن کو کس قدر زور لگا کر سنبھالنا پڑ رہا ھے۔ کبھی کبھی وہ زرا دم لینے کو رکتی جیسے اس کے دل کو خبر ھے کہ ایک ایک قدم پر میری طاقت جواب دئے دے رہی ھے۔

”ھاں۔ زور لگا دو کیچینے بالا، بس اب آپہنچے!“

خود اس کی آواز میں جھنکارناپید ہے اور دم گھٹا جا رہا ہے۔

ہم اناج کی بوریاں ڈال کر جب واپس آتے تو دانیار کا سامنا ہوتا تھا۔ وہ تختوں کی ڈگر پر بھاری اور تلے ہوئے قدموں سے ایک زرا لنگڑاتا چل رہا تھا۔ اپنے معمول سے اب بھی وہ چپ چپ اور تنہا تھا۔ جب وہ ہمارے برابر سے گزرتا تھا تو جلتی ہوئی رنجیدہ نظر سے جمیلہ کو دیکھھ لیتا تھا۔ جمیلہ کمر سیدھی کرتی اور اوپر تک سمیٹا ہوا کرتہ نیچے چھوڑ دیتی۔ ہر بار آتے جاتے وہ جمیلہ کو یوں دیکھتا جیسے پہلی بار نظر پڑی ہے۔ اور جمیلہ اس کی طرف سے برابر غافل ہی رہی۔

ہاں تو یہی صورت مستقل ہو گئی — جمیلہ یا تو اس پر ہنستی یا بالکل بے التفات رہتی۔ اس کا دارومدار تھا اس کے موڈ پر۔ راستے پر ہماری گاڑیاں چلی جا رہی ہیں، ایک دم اس کو خیال آیا ہے اور وہ پکارتی ہے ” ہاں، تو ہو جائے ،، اور سر کے اوپر چابک گھماتے ہوئے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا دیتی ہے۔ میں بھی اپنا چھکڑا پیچھے لگا دیتا ہوں اور ہم دانیار کی گاڑی کو پیچھے چھوڑ کر نکل جاتے ہیں۔ سڑک پر دیر تک دھول اڑتی رہتی ہے اور وہ اسی میں چلتا رہتا ہے۔ اگرچہ یہ سب ہماری چھیڑ خانی تھی لیکن ہر ایک آدمی اسے تھوڑئی برداشت کرتا۔ دانیار تھا ایسا

شخص جیسے بظاہر ہم سے کبھی شکایت نہ ہوئی۔ ہم گاڑیاں دوڑاتے، شور مچاتے برابر سے نکل جاتے اور وہ اپنی گاڑی پر سیدھا بیٹھا سوکھے منہ سے تعریف کا جذبہ لئے ہوئے ہنستی، قہقہے مارتی جمیلہ کو تکا کرتا۔ میں مڑتا تو دیکھتا کہ وہ گرد و غبار کے پردے میں سے اسی کو دیکھے جا رہا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی مہربان اور خطا بخش جیسی چیز تھی ضرور تاہم اس میں مجھے ہمیشہ ایک ضدی پن اور چھپا ہوا غم محسوس ہوا۔

جس طرح دانیار کو جمیلہ کے ہنسی اڑانے پر کبھی غصہ نہ آیا ایسے ہی نظر انداز کر دینے پر وہ کبھی آپے سے باہر نہ ہوا۔ گویا وہ قسم کھائے بیٹھا تھا کہ سب کچھ سہوں گا۔ اول اول تو مجھے اس شخص پر ترس آیا اور میں نے کئی بار جمیلہ سے کہا بھی:

"یہ کیا ہے بھابی! ایسا مسکین آدمی اور اس پر تم ہنستی ہو!"

جمیلہ اس کہنے پر ہنس پڑتی اور ہاتھ ہلا کر جواب دیتی "ارے، بس، یوں ہی، ہم تو مذاق کرتے ہیں۔ اس بدھو کا کچھ نہیں بگڑنے والا!"

اس کے بعد تو میں بھی دانیار سے چھیڑ چھاڑ کرنے اور مذاق اڑانے میں پیچھے نہیں رہا۔ اس کی وہ عجیب عجیب اور ضدی نظریں میرے دل میں چبھنے لگیں۔ جب جمیلہ اپنی پیٹھ پر اناج کی بوری لادتی تھی تو

دانیار کیسی نظروں سے اسے تکتا تھا ! ٹھیک ہے کہ اس شور پکار میں، دھکا پیل میں، بازاری ہنگامے میں ، بھرائی ہوئی آواز اور ہڑبڑائے ہوئے انداز کے لوگوں میں جمیلہ کا اس طرح اطمینان اور سکون سے نپاتلا رہنا اور ہلکے قدموں سے چلنا آنکھوں میں کھبتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ یہ سارا ہنگامہ اس سے کہیں دور برپا ہے۔

اسے ایک نظر بھر کے نہ دیکھا جائے، یہ بھی ممکن نہ تھا۔ چھکڑے کے کنارے سے اناج کی بوری ڈھونے کے لئے وہ اپنا بدن اوپر چڑھاتی، جھکتی، کاندھا آگے کو نکالتی اور سر نیچے جھکا لیتی جس سے اس کی پیاری سی گردن کھل کر سامنے آجاتی تھی اور دھوپ میں جلتی ہوئی چوٹیاں لٹک کر زمین کو چھونے لگتی تھیں۔ دانیار بظاہر دم لینے کو ذرا رکتا لیکن نظریں دروازے تک جملیہ کے ساتھہ ساتھہ لگی رہتیں۔ وہ اپنے دل میں یہی سمجھتا تھا کہ کوئی نہیں دیکھہ رہا مگر میں ایک ایک حرکت دیکھتا تھا اور طبیعت کو ناگوار بھی گزرنے لگا بلکہ ایک حد تک میرے احساس کو ٹھیس لگنے لگی۔ بھلا دانیار کو میں کیسے مان لیتا کہ جمیلہ کے قابل ہے۔

”لو۔ اور لو، یہ بھی میری بھابی کو تاکتا ہے۔ اوروں کا تو کیا ذکر !،، میری ساری ہستی دکھہ گئی۔ بچکانہ خودپسندی جس سے میں ابھی نکلا نہیں تھا

سخت جلن کی آگ میں جلنے لگی۔ بچوں کو ہمیشہ اس بات سے جلن ہوتی ہے کہ ان کے عزیز غیروں کے قریب ہو جائیں۔ اب بجائے اس کے کہ مجھے دانیار پر ترس آتا اور الٹا غصہ آنے لگا اور دوسرے اس کا مذاق اڑاتے تو مجھے اچھا لگتا۔

ایک بار کیا ہوا کہ جمیلہ کا اور میرا مذاق الٹا پڑا اور افسوسناک بات ہو گئی۔ جن بوریوں میں ہم اناج بھرکے لاتے تھے، ان میں ایک بہت بڑا بورا تھا، کوئی تین من کا۔ موٹے اون کا سلا ہوا۔ اسے اٹھا کر لے جانا اکیلے ایک آدمی کے بس کا نہیں تھا اس لئے ہم دونوں مل کر ڈھویا کرتے تھے۔ ایک دن گاھن پر ہمیں دانیار سے شرارت سوجھی۔ جب یہ بورا بھرا جا چکا تو ہم نے وہ اس کے چھکڑے میں ڈال دیا اور اوپر سے کئی بوریاں چڑھا دیں۔ جب ہم گاڑیاں بھرے اسٹیشن کو چلے تو راستے میں جمیلہ اور میں ایک روسی گاؤں کے پاس ٹھیر گئے اور کسی کے باغ میں گھس کر سیب توڑ لئے۔ راستے بھر ہم دونوں ہنستے چلے جا رہے تھے۔ جمیلہ دانیار پر سیب پھینک کر مار رہی تھی۔ پھر جیسے کہ ہمارا قاعدہ تھا، گرد و غبار کے بادل اٹھاتے ہوئے، فراٹے بھرتے ہم اس کی گاڑی سے آگے نکل گئے۔ ریل کا پھاٹک بند تھا۔ اتنے ہم ٹھیریں ٹھیریں، دانیار بھی پیچھے سے آ لیا۔ اس کے بعد ہمارا اس کا اسٹیشن تک ساتھ رہا۔ بڑا بورا جو

اس کے چھکڑے میں نیچے چھپا دیا تھا، اس کو ہم بالکل بھول بھال گئے اور جب تک مال اتارنے کا وقت نہیں ھوا، اس کا خیال ھی نہیں آیا۔ جمیلہ نے میری پسلی میں ٹھوکا دیا اور دانیار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنے چھکڑے پر کھڑا تھا۔ اس بورے کو فکر سے دیکھہ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب اس سے کیسے نبٹا جائے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور جمیلہ کو ھنسی سے لوٹ پوٹ ھوتے دیکھہ کر شرم سے پانی پانی ھو گیا اور سمجھہ گیا کہ اصل معاملہ کیا ھے۔

" پجامہ اوپر کو چڑھا لو — نہیں تو آدھے راستے میں رہ جائے گا!"، جمیلہ نے پکار کر کہا۔

دانیار نے غصے سے ھم دونوں کو دیکھا۔ اور ابھی ھم سوچ بھی نہیں پائے تھے کہ اس نے بورے کو گاڑی کی تہہ میں کنارے تک کھسکایا اور ایک طرف ڈھلکا دیا، نیچے کودا اور ایک ھاتھہ سے تھام کر اپنی پیٹھہ پر دھر لیا۔ بورا اٹھائے وہ روانہ ھوا۔ شروع میں تو ھم نے ایسی صورت بنا لی گویا کوئی خاص بات نہیں ھے اس میں۔ دوسروں کی البتہ اس پر نظر ھی نہیں پڑی۔ آدمی کمر پر بورا لئے چل رہا ھے تو کیا۔ دوسرے بھی چل رہے ھیں۔ لیکن جب دانیار تختوں کی اس ڈگر کے پاس پہنچا تو جمیلہ پیچھے سے اس کے برابر آئی اور بولی :

” بورا اتار دو ۔ میں نے تو مذاق کیا تھا!،،
” ہٹو، جاؤ!،، اس نے ایک ایک حرف الگ کرکے کہا اور تختوں پر چلنے لگا۔

” دیکھنا، لٹے جا رہا ہے!،، جمیلہ نے اس طرح کہا جیسے خود کو حق بجانب دکھا رہی ہو۔ بلکہ اور ڈھکے چھپے ہنس رہی تھی لیکن اس کی ہنسی قدرتی سی نہیں تھی، گویا وہ دل سے نہیں، جبراً ہنس رہی ہو۔

ہمیں دکھائی دیا کہ دانیار اپنی دکھتی ہوئی ٹانگ پر زیادہ جھونک کھانے لگا۔ یہ تو ایسی بات تھی کہ ہمیں پہلے سے سوچنا چاہئے تھا۔ کیا احمقانہ شرارت سوجھی، یہ سب مجھ بےوقوف کی حرکت تھی، میں آج تک اپنا یہ قصور معاف نہیں کر سکتا۔

” لوٹ جاؤ!،، جمیلہ نے بےجان ہنسی کے ساتھ دانیار کو پکارا۔ مگر وہ کیسے لوٹ سکتا تھا۔ اس کے پیچھے لوگ جو چلے آ رہے تھے۔

آگے کیا ہوا مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آتا۔ صرف اتنا دیکھا کہ دانیار اس منوں بوجھ تلے مڑا جا رہا ہے، اس کا سر نیچے جھکا ہوا ہے اور دانت ہونٹوں میں گڑے جاتے ہیں۔ بہت دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا اور زخمی ٹانگ کو سنبھال کر اٹھا رہا تھا۔ ہر قدم اس کے لئے ایسی مصیبت تھی کہ وہ سر کو جھٹکا دیتا اور ایک ایک لمحے دم لیتا۔ اور تختوں پر جتنا

وہ اوپر چڑھا جاتا تھا اتنا ہی دائیں بائیں جھونک کھاتا جاتا تھا۔ بورے نے اسے ہلا ڈالا۔ میں ایسا سہما اور اس قدر شرم آئی کہ حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ اندیشے کے مارے میری ساری ہستی دانیار کے منوں بوجھ تلے پسی جا رہی تھی اور اس کی دکھتی ٹانگ کا درد روئیں روئیں میں محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک جھونک اور کھائی، سر کو پیچھے جھٹکا دیا اور میری آنکھوں میں ہر شے چکرا گئی۔ دنیا اندھیر ہو گئی۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

میں بےہوشی سے ایک دم ہوش میں اس وقت آیا جب اچانک کسی نے میرا ہاتھ اس زور سے پکڑ کر ہلایا کہ ہڈیاں چٹخ گئیں۔ دیکھتے ہی میں جمیلہ کو پہچان نہیں سکا۔ بالکل سفید پڑی تھی۔ پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دیدے پھٹے تھے اور ہونٹوں پر ہنسی جم کر رہ گئی تھی۔ اتنے میں ہم ہی نہیں بلکہ ہر شخص یہاں تک کہ مال وصول کرنےوالا منشی بھی تختوں کی چڑھائی کی طرف دوڑ پڑا۔ دانیار نے دو قدم اور بڑھائے۔ چاہتا تھا کہ پیٹھ پر بورا ٹھیک سے سنبھال لے کہ گھٹنا جواب دے گیا۔ جمیلہ نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔

”ڈال دے، ڈال دے بورا!“ وہ تڑپ کر بولی۔

مگر دانیار نےجانے کیوں بورا نہیں ڈالا، حالاں کہ چاہئے یہ تھا کہ بہت پہلے ہی وہ تختوں پر سے

ایک طرف کو بورا ڈھلکا دیتا تاکہ پیچھے سے آنےوالوں کو نہ دبا دے۔ جمیلہ کی ھانک سن کر اس نے آگے کو زور کیا، اپنی ٹانگ سیدھی کی، ایک قدم اور آگے بڑھایا اور پھر سنبھلنا بھاری ہو گیا۔

’ ھاں ، ھاں ، ابے پھینک دے، کتے کی اولاد ! ،، منشی غرایا۔

’’ پھینک دے ! ،، سب لوگ چیخ پڑے۔

دانیار اس پر بھی ڈٹا رھا۔

’’ نہیں ، وہ نہیں پھینکنے والا ! ،، کسی نے آھستہ سے پورے یقین کے ساتھہ کہا۔

معلوم ھوتا ھے کہ جتنے بھی لوگ تھے، تختے پر اس کے پیچھے پیچھے چلنےوالے اور نیچے کھڑے ھوئے سب نے جان لیا کہ نہیں، یہ شخص بورا نہیں الٹے گا جب تک کہ خود بھی اس کے ساتھہ ھی نہ الٹ جائے۔ ھر طرف موت کا ساسناٹا ھو گیا، دیوار کے پار سے انجن نے زور سے سیٹی دی۔

دانیار جھولتا ھوا بڑھا جیسے دنیا جہان سے بےخبر ھو اور ڈگر کے تختوں کو چرچراتا ھوا اوپر کی طرف چڑھتا رھا جہاں لوھے کا سائبان پڑا تھا۔ دو قدم اٹھاتا، پھر تھم جاتا۔ دم لیتا، سنبھلتا اور پھر ساری قوت سمیٹ کر آگے بڑھتا۔ جو لوگ پیچھے اپنا بوجھہ اٹھائے آ رھے تھے وہ بھی اس کے پابند ھو گئے اور ساتھہ ساتھہ ٹھیرنے لگے۔ اس سے لوگوں کی جان

پر بن گئی۔ رہی سہی طاقت جواب دینے لگی مگر کیا مجال جو کوئی اف کر جائے، کسی نے اس کو برا بھلا تک نہ کہا۔ اپنا اپنا بوجھ سنبھالے سب کے سب اس طرح بڑھ رہے تھے گویا کسی ان دیکھی رسی میں جکڑے ہوئے ہیں اور خطرناک، پھسلواں تختوں پر، جہاں ایک کی زندگی دوسرے کے ہاتھ ہے، سرک رہے ہیں۔ ان کے خاموش راضی برضا ہونے میں اور یکساں جھونک کھانے میں ایک ہی آہنگ تھا۔ ایک قدم، اور ایک قدم دانیار کے پیچھے پیچھے، اور ایک قدم۔ کس قدر دکھ سے خدا خدا کرکے، دانت پیس پیس کر وہ سپاہی کی عورت اسے دیکھ رہی تھی جو کمر پر بوجھ لادے بالکل پیچھے آتی تھی۔ خود اس عورت کی ٹانگیں بول رہی تھیں مگر اسے فکر اپنی نہیں، آگے والے آدمی کی تھی۔

بہت تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی۔ تختوں کا چڑھائی والا حصہ ختم ہونےوالا تھا کہ اتنے میں دانیارنے پھر جھونک کھائی۔ اب اس کی زخمی ٹانگ نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ایسے میں اگر وہ بورے کو پھینک نہ دیتا تو خود بھی گرنے ہی والا تھا۔

”دوڑو! پیچھے سے سنبھالا دو اسے!“، جمیلہ نے مجھے ہانک لگائی اور خود گھبراہٹ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر رہ گئی جیسے دانیار کو اس سے کوئی مدد ملتی ہو۔

میں تختوں پر اوپر کی طرف لپکا۔ لوگوں اور بوریوں کے بیچ میں سے بچتا بچاتا دانیار تک جا پہنچا۔ اس نے مجھ پر پہلو میں سے ایک نظر ڈالی۔ اس کے پسینے سے تربتر بےنور ماتھے پر رگیں ابھر آئی تھیں۔ سرخ انگارہ آنکھوں سے غصے اور نفرت کی آنچ مجھ تک پہنچی۔ میں نے چاہا کہ اس کے بورے کو پیچھے سے سہارا دوں۔

" ہٹو، جاؤ! "، دانیار نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈانٹا اور آگے کو سرکا۔

جب وہ اوپر بورا پہنچا کر اترا ہے تو سانس پھولا ہوا تھا، ٹانگ لنگڑا رہی تھی، ہاتھ جھول رہے تھے کوڑے کی طرح۔ سب لوگوں نے چپ‌چاپ اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا، ایک وہ منشی تھا مال وصول کرنےوالا جو ضبط نہ کر سکا اور چیخ کر بولا:

" کیا ہے رے جوان، دماغ چل گیا؟ کیا سمجھا ہے تونے، میں آدمی نہیں ہوں؟ کیا میں یہ بھاری بورا نیچے ہی جھاڑنے کی اجازت نہ دیتا؟ ایسے بورے ڈھونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ "

" میں جانوں، میرا کام "، دانیار نے آہستہ سے جواب دیا اور ایک طرف تھوک کر اپنے چھکڑے کی طرف ہو لیا۔ ہماری حالت یہ تھی کہ نگاہ اونچی نہ ہوتی تھی۔ شرم بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی کہ ہمارے

پاگلوں کے سے مذاق کو اس شخص نے یوں دل کے نزدیک جگہ دی۔

رات بھر ہماری گاڑیاں چلتی رہیں اور ہم چپ رہے۔ دانیار کے لئے تو خیر، خاموشی ایک قدرتی بات تھی۔ اسی لئے ہماری سمجھہ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس حرکت پر ناراض ہے یا بھول بھال گیا۔ مگر ہمارے دل پر سخت بوجھہ تھا۔ اندر کوئی کچوکے دے رہا تھا۔

دوسرے دن صبح، جب ہم گاھنے کے ٹھکانے پر اناج بھر رہے تھے، تو جمیلہ نے اس کم بخت بورے کو لے کر ایک کنارے پر زور سے پاؤں رکھا اور چیر کر ٹکڑے کر دیا۔

" لو۔ یہ رہا تمہارا چیتھڑا ! "، اس نے تولنے والی کے پیروں میں وہ پھٹے ٹکڑے ڈال کر کہا۔ وہ عورت حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ " ٹیم کے لیڈر سے کہہ دینا کہ آئندہ ایسے بورے مت تھوپنا ہمارے سر ! "

" کیا ہوا ؟ کیا ہوگیا تمہیں ؟ "

" کچھہ نہیں، کچھہ نہیں ہوا ! "

دوسرے روز دن بھر دانیار نے کسی صورت میں بھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ ناراض ہے۔ برتاؤ میں حسب معمول رہا اور چپ چپ۔ بس اتنا فرق پڑا کہ اب وہ پہلے سے کچھہ زیادہ لنگڑا رہا تھا، خاص کر بوریاں ڈھوتے وقت۔ غالباً کل اس کے زخم پر زیادہ دباؤ پڑ

گیا۔ اس کے سبب ہم دونوں تمام وقت خود کو اس کا قصوروار سمجھتے رہے۔ اگر وہ زرا ہنس ہی دیتا یا چھیڑ چھاڑ ہی کر دیتا تو ہمارے من کا بوجھ اتر جاتا۔ اپنی خطا کو ہم نے دل سے دھو لیا ہوتا — مگر نہیں۔

جمیلہ بھی بظاہر ایسی بن رہی تھی کہ کوئی خاص بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی اکڑفوں لڑکی، دیکھنے میں تو ہمیشہ کی طرح ہنستی ہنساتی رہی لیکن میں نے تاڑ لیا کہ یہ سب اوپری ہنسی ہے۔

جب ہم اسٹیشن سے گھر لوٹ رہے تھے تو کافی رات جا چکی تھی۔ دانیار آگے آگے اپنی سواری پر تھا۔ رات بڑی شاندار تھی۔ کون ہے جو اگست کی راتوں سے بےخبر ہو کہ ان میں بڑے چمکیلے ستارے ایک ہی وقت میں کتنے دور اور کتنے پاس نظر آتے ہیں۔ وہ بہت دور ایک ستارہ دکھائی دیا۔ لگتا ہے کہ کناروں پر جم کر رہ گیا۔ سراسر برفیلی کرنوں میں نہایا ہوا، نیچے زمین کو حیرت بھری نظروں سے جھانک رہا ہے۔ گھاٹی میں سے جب ہماری گاڑیاں گزر رہی تھیں تو میں اسی ستارے کو تکتا رہا۔ گھوڑوں کو تھان پر پہنچنے کی جلدی پڑی تھی، وہ سرپٹ جا رہے تھے اور پہیوں کے نیچے کنکر پتھر بول رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے اسٹیپی کی طرف سے کھلتی ہوئی افسنتین کی کڑوی بو، پکے جوار کی سوندھی مہک

لئے آ رہے تھے اور ان میں جب کولتار کی اور گھوڑوں کے پسینے کی بدبو مل گئی تو دھیرے دھیرے سر کو گھمیر آنے لگی۔

سڑک پر ایک طرف جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے پتھریلے کگارے جھکے تھے تو دوسری طرف گہرے کھڈوں میں شیشم اور بید کی جھاڑیوں میں دریائے کورکوریو بہت زوروں میں شراٹے مار رہا تھا۔ بہت دور کہیں پل پر سے ریل گاڑیاں کھڑکھڑاتی ہوئی گزرتیں تو ان کے بہت بعد تک پہیوں کی آواز پٹریوں پر گونجتی رہتی۔

بڑا اچھا لگ رہا تھا ہلکی خنکی میں چھکڑوں پر سفر کرنا، گھوڑوں کی ہلتی جلتی پیٹھوں کا نظارہ کرنا، اگست کی رات کی آوازیں سننا اور اس کی مہکوں میں سانس لینا۔ جمیلہ اپنے چھکڑے پر مجھ سے آگے جا رہی تھی۔ راس ہلکی چھوڑے ہوئے وہ بہت دھیمے سروں میں کچھ گا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ہماری خاموشی اس کے دل پر سخت بار بن گئی ہے۔ ایسی رات اور اس میں ہونٹ سیے رہنا، ناممکن! ایسی رات میں تو گانے کو جی چاہتا ہے۔

آخر وہ گانے لگی۔ اس نے شاید اس لئے بھی گانا شروع کیا کہ وہ دانیار کے ساتھ ہمارے پہلے کے سے بےتکلفانہ ہنسنے بولنے کے تعلقات واپس لانا چاہتی تھی اور اس کے آگے اپنے قصوروار ہونے کا بوجھ دل سے اتار دینا چاہتی تھی۔ کیا جھنکتی ہوئی، زوردار

آواز اس نے پائی تھی ! اور پھر گائے بھی تو گاؤں کے وھی معمولی گیت مثلاً : ” ریشمی دوپٹہ میرا، دیکھہ تجھے لہرائے ،، یا ” دور دیس سدھارے ساجن ،،۔ جمیلہ کو بہت سے گانے آتے تھے اور وہ موج میں آکے گاتی تھی کہ سننے میں لطف آئے۔ گاتے گاتے وہ ایک دم رکی اور دانیار کو پکارا :

” اے دانیار، گاتے نہیں۔ کچھہ تو گاؤ۔ جگیت ھو کہ نہیں ؟ ،،

” گاؤ، جمیلہ تم ھی گاؤ ! ،، اس نے گڑبڑا کر جواب دیا اور گھوڑوں کی راس کھینچ لی۔ ” اے، میں سن رہا ھوں، دونوں کان کھولے ! ،،

” اور تم نے کیا سمجھا کہ کان نہیں ھیں ھمارے۔ جی نہیں چاھتا گانے کو، نہ سہی ! ،، اور جمیلہ پھر آپ ھی گانے لگی۔

کون جانے جمیلہ نے دانیار سے گانے کو کیوں کہا۔ ممکن ھے بس یوں ھی کہہ دیا ھو۔ ممکن ھے اسی بہانے بات چیت چھیڑنا چاھتی ھو۔ زیادہ قیاس یہی ھے کہ دانیار سے بات کرنے کو اس کا جی چاھا تھا کیوں کہ زرا دیر ٹھیر کر اس نے پھر زور سے آواز دی :

” اے دانیار، تم نے کبھی کسی سے محبت بھی کی ھے ؟ ،، اتنا کہہ کے خود ھنس پڑی۔

دانیار نے کوئی جواب نہیں دیا، جمیلہ بھی چپ سادھہ گئی۔

”گانے کو بھی کہا تو کس سے کہا !“، میں نے دل ہی دل میں ہنس کر سوچا۔

پہاڑی نالہ راستہ کاٹ کر جاتا تھا۔ گھوڑے اس کو پار کرتے ہوئے آہستہ قدم اٹھانے لگے۔ ان کے سموں تلے پانی میں بھیگے ہوئے اور چاندی سے چمکتے ہوئے کنکر پتھر بولنے لگے۔ جب ہم گھاٹ اتر لئے تو دانیار نے اپنے گھوڑوں پر ہنٹر اڑائے اور ایک دبی بھنچی آواز میں گانے لگا جو راستے کے ہر ایک دھچکے پر بے سری ہو جاتی تھی :

میرے پہاڑو، نیلے پیلے پہاڑو،
دھرتی رے میری، میرے پرکھوں کی دھرتی !

اتنے میں اس کی آواز بگڑی۔ کھانسی اٹھی اور پھر آگے کے بول اس نے بہت گہری اور سینے سے دھونکتی ہوئی آواز میں گائے، مگر زرا بھرائے ہوئے گلے سے :

میرے پہاڑو، نیلے پیلے پہاڑو،
میرے جھولا جھلانے والو !

پھر اس کی آواز پھنسنے لگی جیسے کسی چیز سے ڈر گیا ہو اور وہ چپ ہو گیا۔

مجھے صاف صاف اندازہ ہو گیا کہ اندر سے اسے کس قدر شرمندگی ہو رہی ہے۔ مگر اس جھجک

اور بےربطی کے ساتھہ گانے میں بھی کوئی بات ایسی ضرور تھی جو آدمی کے دل کو ہلا ڈالتی اور ہاں، آواز لازمی طور پر بہت خوب تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہی دانیار ہے۔

"دیکھتی ہو!"، آخر مجھہ سے صبر نہ ہو سکا۔ اور جمیلہ بھی پکار اٹھی :

"پہلے کیوں چھپے ہوئے تھے؟ اب گاؤ۔ گاؤ ٹھیک طرح سے!"

جب ہم گھاٹی سے نکلنے کے قریب تھے تو سامنے اجالا ہو رہا تھا۔ ادھر سے نسیم سحر کے جھونکے آنے لگے۔ دانیار نے پھر گانا اٹھایا۔ پہلے کی طرح اب بھی اس نے دبے دبے اور جھجکتے ہوئے گیت چھیڑا تھا مگر رفتہ رفتہ گلا کھلتا چلا گیا۔ گھاٹی اس کے نغمے سے بھر گئی اور دور دور کی چٹانوں سے گونج سنائی دینے لگی۔

سب سے بڑھہ کر میں حیران رہ گیا کہ یہ راگ کس قدر سوز و گداز لئے ہوئے ہے، کس قدر جذبے کی آنچ میں تپا ہوا ہے۔ سمجھہ میں نہ تب آیا تھا کہ اسے کیا کہتے ہیں، نہ اب آیا ہے۔ اور میں ٹھیک طرح سے جانچ کر بتا نہیں سکتا کہ کیا یہ محض گلا تھا یا اس کے سوا کوئی اور چیز تھی، وہ صدا جو انسان کی روح سے نکلتی ہے۔ کوئی ایسی صدا جو دوسروں میں بھی ویسی ہی لہر دوڑانے کا کمال رکھتی ہے اور

انسان کے سب سے درپردہ خیالوں کو زندگی عطا کردیتی ہے۔

کاش میں دانیار کے گانے کی، پوری طرح نہ سہی، کچھ ادھوری نقل اتار سکتا۔ گانے میں لفظ ہی کیا تھے، مگر بےالفاظ اس نے انسان کی مہان آتما کو کھول کر رکھ دیا۔ ایسا گانا نہ اس سے پہلے کبھی میں نے سنا تھا، نہ اس کے بعد سنا۔ نہ اس میں ہم قرغیزوں کے گانوں کی سی بات تھی، نہ قزاخوں کی سی مگر یوں بھی تھا اور یوں بھی۔ دانیار نے جو گانا اس رات گایا اس میں رشتے کی دونوں قوموں کی سب سے عمدہ راگنیاں سموئی ہوئی تھیں اور ایسے بےمثل انداز میں ایک دوسری میں گھل مل گئی تھیں کہ ان کا دھرانا ممکن نہ تھا۔ پہاڑوں اور اسٹیپی میدانوں کا گیت تھا یہ، کبھی جھنکار کے ساتھ اونچا اٹھتا، جیسے قرغیزوں کے پہاڑ، کبھی دور دور تک پھیل جاتا جیسے قزاخوں کے اسٹیپی۔

میں نے یہ گانا سنا اور حیران رہ گیا: "تو یہ ہے، چھپا رستم نکلا! کسے خبر تھی کہ دانیار میں یہ گن موجود ہیں!"

ہماری گاڑیاں اسٹیپی کے نرم راستے پر لیکھ لیکھ جا رہی تھیں۔ اب دانیار کا گلا گانے سے کھل چکا تھا اور ایک کے بعد نئے سے نئے گانے امنڈے چلے آ رہے تھے۔ اوہ، کیسی دولت لئے بیٹھا تھا یہ شخص! کیا

ھو گیا تھا اسے؟ عجب نہیں کہ انتظار میں تھا کہ اس کا اپنا دن آئے، اپنا لمحہ آئے تو کھلے!

دم کے دم میں اس کا وہ عجوبہ‌پن میری سمجھ‌ہ میں آ گیا جو لوگوں کے لئے ایک پہیلی تھا، جس پر لوگ ھنسا کرتے تھے — اس کا وہ اپنی ادھیڑبن میں رھنا اور تنہائی پسند کرنا، ھونٹ سیے رھنا۔ اب جاکے میں سمجھا کہ وہ آدھی آدھی رات گئے تک اونچے ٹیلے پر کیوں بیٹھا رھتا تھا، دریا کے کنارے ساری رات اکیلا کیوں گزار دیتا تھا اور ایسی آوازیں کیوں مستقل طور پر کان لگا کے سنا کرتا تھا جو دوسروں کے کان میں نہیں پڑتی تھیں، اور بعض اوقات اس کی آنکھیں کیوں جلنے لگتی تھیں اور عام طور سے کھنچی ھوئی بھویں کیوں تن جاتی تھیں، اب میں نے جانا کہ یہ آدمی تو عشق میں گرفتار تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا عشق ایسا نہیں تھا کہ کسی دوسری ھستی سے ھے اور بس۔ نہیں، یہ کوئی اور ھی عشق تھا، بےپناہ اور زبردست عشق زندگی سے اور زمین سے۔ ھاں واقعی، اس عشق کو وہ سینے میں لئے پھرتا تھا اور سنگیت میں بسائے ھوئے تھا۔ وہ اس عشق میں بسر کرتا تھا۔ جس کے سینے میں یہ آگ نہ ھو وہ محض گلے یا راگ کے بل بوتے پر اس طرح نہیں گا سکتا تھا۔

جب یہ لگتا کہ گانے کی آخری آوازیں ڈوبی جا رھی ھیں تو ان کے فوراً بعد ایک نئی زوردار گونجتی، گرجتی

لہر اٹھتی اور اونگھتے ہوئے اسٹیپی کو جگا دیتی۔ اور وہ شکر گزاری کے ساتھہ اس گانےوالے کی آواز سننے اگتا جو اپنے پیارے مدھہ بھرے نغمے سے اسٹیپی کو راحت دے رہا تھا۔ گیہوں کی پکی بالیاں اس انتظار میں کہ اب اٹھائی جائیں، ایک بڑی جھیل کی طرح لہلہا رہی تھیں اور تڑکے کا اجالا کھیتوں پر پھیلنے لگا تھا۔ پرانے بید کا ایک بہت بڑا جھنڈ اناج کی چکی پر زور زور سرسرا رہا تھا، دریا پار کھیتی ہاروں کے الاؤ جل جل کر ٹھنڈے ہو چلے تھے اور کوئی سوار تھا جو سائے کی طرح آہٹ کئے بغیر دریا کنارے گاؤں کی سمت چلا جا رہا تھا۔ کبھی باغوں میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا، کبھی پھر نظر آجاتا۔ ہوا اس طرف سے سیبوں کی مہک اور کھلتی ہوئی مکئی کی دودھہ جیسی ھیک، اور سوکھتے اپلوں کی گرم بساند لئے چلی آرہی تھی۔

دانیار دیر تک گاتا رہا۔ اور اپنے آپے سے غافل گاتا رہا۔ اور اگست کی رات جھوم جھوم کر اس کا گانا سنتی رہی۔ یہاں تک کہ گھوڑے بھی کافی دیر سے ناپ ناپ کے قدم رکھنے لگے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ یہ طلسم ٹوٹ نہ جائے۔

اتنے میں جب گانا پنچم پر پہنچا تو دانیار نے ایک دم تان توڑدی، گھوڑوں کو کھونچ مارکر تیز دوڑا دیا۔ میں نے سوچا جمیلہ بھی اس کے پیچھے گھوڑے ڈال دے گی اور اس لئے میں بھی تیار ہونے لگا لیکن

نہیں وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اپنا سر جھکائے بیٹھی رہی جیسے ہوا میں بکھرتی ہوئی آخری تان کو غور سے سن رہی ہو۔ دانیار اپنے چھکڑے پر چمپت ہو گیا مگر ہم دونوں کے دونوں گؤں آنے تک بالکل خاموش رہے۔ اور پھر کہنے سننے کی ضرورت بھی کیا تھی، ایسی بھی تو باتیں ہوتی ہیں جو ہمیشہ لفظوں میں پوری طرح نہیں کہی جاتی ہیں۔

اس روز سے ہماری زندگی میں، معلوم ہوتا تھا، کچھہ تبدیلی سی ہو گئی۔ اب مجھے ہمیشہ کسی اچھی بات کے ہونے کا، دلی مراد ملنے کا آسرا رہنے لگا۔ صبح سے ہم گاہنے کی جگہ پر اپنے چھکڑے بھرتے، اسٹیشن کو اناج ڈھوتے اور واپسی کی جلدی پڑی رہتی تاکہ گھر لوٹتے میں دانیار کا گانا سنا جا سکے۔ اس کی آواز میری ہستی کا ایک حصہ بن گئی تھی، ہر جگہ میرے دم کے ساتھہ ساتھہ رہتی۔ صبح کو جب میں لوسرن کے اوس بھرے کھیت پر سے دوڑتا ہوا پچھاڑی بندھے گھوڑوں کی طرف جاتا تھا اور پہاڑیوں کے پیچھے سے مسکراتا ہوا سورج اٹھہ کر مجھے سلام کرتا تب بھی یہ آواز میرے ساتھہ ہوتی اور یہ آواز مجھے وہاں بھی سنائی دیتی تھی جہاں گیہوں کو پھٹکنے والے بوڑھے لوگ ہوا میں سنہرے دانوں کی بارش کرتے اور اناج اور بھوسا الگ کیا جاتا، اور اس وقت بھی جب میں کسی اکیلے شکرے کو اسٹیپی کے اوپر آسمانوں

میں دل فریبی سے چکر کاٹتے دیکھتا۔ ہر چیز میں جو میں دیکھتا یا سنتا دانیار کی ہی موسیقی کا گمان گزرتا تھا۔

شام کو جب ہم گھاٹی میں سے ہوتے ہوئے گزرتے تو مجھے ہر بار یہ لگتا تھا کہ دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ آنکھیں ادھ کھلی ہوتیں اور میں دانیار کا گانا سننے میں محو ہوتا تو میرے سامنے ایسے منظر ابھرنے لگتے جنہیں میں بچپن سے پیار کرتا تھا : وہ دیکھو ہماری یورتاؤں (چھولداریوں) کے اوپر سے بہار کے نرم نرم بادل، دھوئیں کی طرح نیلگوں اور سارس کی طرح اونچے اونچے اڑے چلے جا رہے ہیں، وہ دیکھو گھوڑوں کے گلے دندناتے ہوئے گرمیوں کی چراگاہوں کو چلے اور زمین گونج گئی اور چلبلے بچھیرے، جن کی ایال بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک ہے اٹھلا اٹھلا کر اپنی ماؤں سے آگے نکلے جا رہے ہیں، وہ دیکھو پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کے ریوڑ آہستہ آہستہ لاوے کی طرح ابل پڑے، وہ دیکھو چٹان پر سے آبشار گر رہا ہے اور اس کے سفید سفید جھاگوں سے آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں، وہ دیکھو دریا کے اس پار نوکدار گھاس کے جھاڑ جھنکاڑ میں سورج دھیرے سے بیٹھ رہا ہے اور افق کے انگارہ جیسے کگارے پر بہت دور جاتا ہوا شہسوار معلوم ہوتا ہے کہ سورج کی تلاش میں گھوڑا اڑائے جا رہا ہے، بس ہاتھ بڑھانے کی دیر

ہے کہ سورج کو پکڑا اور پھر خود بھی جھاڑیوں میں اور شام کے جھٹپٹے میں گم ہوا۔

دریا کے اس پار قزاخستان کے چٹیل اسٹیپی میدان دور دور پھیلے ہیں۔ ہمارے پہاڑوں کو دونوں طرف سے ہٹا کر درمیان میں یہی میدان منہ چڑھائے ہوئے پڑے ہیں اور ان میں آدمی کا نام نشان نہیں...

لیکن جنگ کے زمانے کی ان یادگار گرمیوں میں اسٹیپی میں جا بجا آگ جلتی رہتی تھی، فوجی گھوڑوں کے دستے کے گرم خاک اڑاتے گزرتے اور وہ اس آگ میں پڑتی رہتی۔ ہر طرف گھوڑسواروں کی دندناہٹ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ دریا کی دوسری جانب سے ایک قزاخ شہسوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور گڈریوں کی سی ہانک لگا کر بولا ” ہاں قرغیزو، رکاب میں پاؤں رکھو، دشمن آ پہنچا “، اور دھول کے پردے میں، لو کے جھونکوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اسٹیپی نے سبھوں کو کمر باندھ تیار کر دیا۔ پہاڑوں پر سے نیچے وادی میں ہماری پہلی سوار پلٹنیں اتریں تو بڑی آن‌بان سے خوب تنی ہوئی آگے بڑھیں۔ ہزاروں گھوڑوں کے ساز ایک ساتھ جھنجھناتے تھے، ہزاروں جوان نکل کر آتے تھے، ان کے آگے آگے علمبرداروں کے ہاتھوں میں لال پرچم لہراتے اور ان کے پیچھے پیچھے سموں سے اڑے ہوئے غبار میں بیویوں اور ماؤں

کے دلدوز بین زمین سے ٹکراتے تھے ''جاؤ، سدھارو، اسٹیپی تمھارے نگہبان ! سورما بزرگ ماناس کا تم پر سایہ رہے ! ''

وہاں جہاں لوگ لڑائی کو سدھارے، درد بھری راهیں پڑی رہ گئیں۔

دانیار نے اپنے نغموں سے ارضی حسن اور فکروں پریشانیوں کی یہ ساری کائنات میری نظروں کے سامنے بےنقاب کی تھی۔ خود اس نے یہ سب کہاں سے سیکھہ لئے، کس سے سن لئے ؟ میں سمجھہ گیا کہ اپنی زمین سے اس طرح محبت کرنا صرف اسی کے بس کی بات ہے جو سالہا سال تن‌من سے اس کی خدمت میں لگا رہا ہو، اس محبت کے غم میں گھلتا رہا ہو۔ جب دانیار گانا گانے لگتا تو مجھے نظر آتا کہ وہ ایک چھوٹا سا لڑکا ہے جو اسٹیپی میں ادھر سے ادھر کی خاک چھانتا پھر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی زمانے میں وطن کے ان گیتوں نے اس کی روح میں آنکھیں کھولی ہوں اور ممکن ہے کہ بعد میں ان کا جنم ہوا ہو جب وہ جنگ کے کڑے کوس مارتا پھر رہا تھا۔

جب میں دانیار کا گانا سنتا تو جی چاہتا، گرکے دھرتی کو سینے سے لگا لوں، بیٹے کی طرح اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لوں کہ آدمی اس سے یوں جی توڑ کے بھی پیار کر سکتا ہے۔ پہلی بار میرے دل کو لگا کہ کوئی نئی چیز میرے اندر پیدا ہوئی ہے، کوئی ایسی

چیز جس کا اب تک مجھے نام بھی معلوم نہ تھا، کوئی ایسی چیز جس پر قابو پانا ممکن نہ تھا، جو مجھے مجبور کرتی تھی کہ اپنے دل کی حقیقت دوسروں پر کھولوں، ہاں ہاں، اسے بیان کر دوں، زندگی اور کائنات کو خود دیکھ لینے اور محسوس کرنے پر قناعت نہ کروں بلکہ اپنے مشاہدے کو، اپنی فکرونظر کو، اپنے احساس کو سب پر عام کر دوں اور لوگوں سے اپنی زمین کا حسن ایسے بیان کروں ولولے کے ساتھ جیسے دانیار کو بیان کرنا آتا ہے۔ میں کسی ان جانی چیز کے سامنے بے پناہ خوف اور مسرت کے مارے لرزتا تھا۔ کیا خبر تھی مجھ کو کہ تصویرکشی کے لئے یہ موقلم سنبھالنے کی تڑپ ہے۔

تصویریں بنانا مجھے بچپن سے پسند تھا۔ اسکول کی کتاب میں جو تصویریں ہوتی تھیں میں ان کی نقل کر لیا کرتا تھا اور لڑکوں کا کہنا تھا کہ میری نقل ''ہو بہ ہو'' نکلتی ہے۔ اسکول کے ماسٹر بھی تعریف کیا کرتے تھے جب میں دیواری اخبار کے لئے تصویریں بنا کر تیار کرتا۔ پھر یہ ہوا کہ جنگ چھڑ گئی۔ میرے بھائی فوج میں چلے گئے۔ میں نے اسکول چھوڑ دیا اور اپنے برابروالوں کی طرح خود بھی کالخوز میں کام پر لگ گیا۔ برش ورش سب بھول بھال گیا اور کبھی خیال تک نہ آیا کہ ان سے واسطہ پڑے گا۔ لیکن دانیار کے گانوں نے میری روح کو جھنجھوڑ دیا۔ گویا میں نیند میں تھا۔ آنکھ کھلی تو دنیا کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

اور جمیله کا عجب عالم تھا۔ ایسے بدل گئی جیسے وہ پہلے کبھی لڑاکا، زباں‌دراز، ھنسوڑ لڑکی تھی ھی نہیں۔ کوئی بہار کی اجلی اجلی اداسی تھی جو اس کی بجھی ھوئی آنکھوں میں بھری رھتی تھی۔ راستے بھر وہ کسی ادھیڑبن میں مبتلا رھنے لگی۔ لبوں پر مبہم سی خواب‌آلود مسکراھٹ کھیل جاتی تھی اور کسی خوشگوار بات پر وہ دل ھی دل میں مزا لیتی۔ کیا بات تھی وہ، جمیله کے سوا کوئی نه جانتا تھا۔ ایسا بھی ھونے لگا که پیٹھه پر اناج کی بوری لادلی ھے اور چپ چاپ کھڑی ھے، شرم وحجاب کے گورکھه دھندے میں مبتلا، گویا کوئی طوفانی ندی درپیش ھے اور طے نہیں کر پائی که آگے بڑھے یا نه بڑھے۔ دانیار سے اب وہ آنکھیں چار کرتے کترانے لگی۔

ایک بار جب گاھن پر دونوں موجود تھے، جمیله نے اپنے دکھه سے تنگ آکر آخر اس سے کہه ھی دیا :

” تم اپنی یه قمیص اگر اتار دیتے تو اچھا تھا۔ میں دھو ھی ڈالتی۔ “

اور جب وہ قمیص دھو چکی تو سوکھنے پھیلا دی اور خود اس کے پاس دیر تک بیٹھی ھاتھه سے شل نکالتی رھی، پھر دھوپ میں اٹھا اٹھاکر گھسے ھوئے کاندھے دیکھے، سر ھلایا اور افسوس کے ساتھه خاموشی سے پھر اس کی شکنیں ٹھیک کرتی رھی۔

اس تمام عرصے میں صرف ایک بار ایسا ھوا که

جمیله پہلے کی طرح زور سے ہنسی، ایسے ہنسی کہ دیکھے سے ہنسی آ جائے اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ہوا یہ تھا کہ کچھ نوجوان عورتیں، لڑکیاں اور لام پر سے آئے ہوئے جگیت جوان اناج گاہنے کے ٹھکانے کے پاس سے دھوم مچاتے گزرے۔ یہ لوگ لوسرن کے کھلیانوں سے آرہے تھے۔ ان جوانوں نے چھیڑ خانی کرتے ہوئے پکارا :

”ارے او چودھریو ! گیہوں کی روٹی کھانے کو تم ہی نہیں رہ گئے ہو۔ ہماری بھی خاطر تواضع کرو نہیں تو اٹھا کے دریا میں پھینک دیں گے،، یہ کہتے ہوئے انہوں نے پچنگوڑے دکھائے۔

”پچنگوڑے دکھا کے مت ڈراؤ ہمیں۔ ان بہنوں کی تو خاطر کر دوں گی میں لیکن تم مسٹنڈے خود تلاش کرو! ،، جمیله نے گونجتی ہوئی آواز میں ترکی به ترکی جواب دیا۔

”اچھا، یہ بات ؟ تو تم سب کو ڈبونا پڑے گا ! ،،

اتنے میں لڑکوں لڑکیوں کی دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ چیخ پکار، کلکاریاں، ہنسی، قہقہے، اور ایک دوسرے کو پانی میں ڈھکیلنے کی کوشش۔

”پکڑو انہیں، ٹانگ کھینچو ! ،، سب سے اونچی آواز میں جمیله ہی ہنس رہی تھی اور جلدی جلدی پھرتی کے ساتھ پکڑنے والوں سے کنی کاٹ کر نکل جاتی تھی۔

مگر عجیب بات، ان جگیت جوانوں کو نظر بھی
آئی تو بس جمیلہ۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ اسی
کو پکڑے اور بھینچ لے۔ آخر تین نوجوانوں نے اسے
گھیر لیا اور ڈنڈاڈولی کرکے دریا پر لے آئے۔

"پیار کرو ہمارے — نہیں تو وہ پھینکا!"

"ہاں، دینا زرا ایک اور جھونٹا!"

جمیلہ نے پلٹے کھائے۔ زور زور قہقہے لگائے،
سر کو جھٹکے دے کر چھڑایا اور ہنستے ہنستے اپنی
سکھی سہیلیوں کو مدد کے لئے پکارا مگر وہ خود ہی
دریا کنارے ہابڑ دھابڑ میں تھیں اور پانی میں سے
اپنے دوپٹے کھینچ رہی تھیں۔ جمیلہ پانی میں جا
پڑی اور جگیتوں کی ہنسی ہو گئی۔ پانی سے نکلی
تو گیلے بالوں میں پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔
اب وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔
سوتی کپڑے کا کرتہ شرابور ہوا تو سارے بدن پر
چپک گیا، گول گول بھاری کولھے اور لڑکیوں کا
سا ابھرا سینہ اور نکل آیا، اسے خود کسی بات کا ہوش
نہ تھا، ہنسی کے مارے دہری ہوئی جاتی تھی اور
اس کے تمتمائے ہوئے چہرے پر رم جھم پانی کی دھاریں
رواں تھیں۔

"چومو ہمیں"، جگیت پھر اس کے سر ہو گئے۔

جمیلہ نے انہیں چوما مگر انہوں نے پھر اسے پانی
میں ڈھکیل دیا۔ پھر وہ ٹھٹھے مارتی رہی اور منہ

پر سے بالوں کی موٹی موٹی لٹیں پیچھے کو ہٹاتی رہی۔
چھوکروں کی اس شرارت پر، جتنے لوگ گاھنے کے ٹھکانے موجود تھے سبھی کو ھنسی چھوٹ رہی تھی۔ بڈھے بڈھے پچھوڑنےوالے اپنے ھاتھه کے پھاوڑے چھوڑ کر آنکھوں سے خوشی کے آنسو صاف کرنے لگے اور ان کے بےنور چہروں کی جھریاں خوشی کے مارے چمک اٹھیں اور لمحے بھر کو نوجوانی کا رنگ دوڑ گیا۔ میں خود جی کھول کر ھنسا اور اس بار یه بھی بھول گیا که رقابت کی طرف سے یه فرض مجھه پر عائد ھوتا ھے که جمیله کو ان جوانوں سے بچاؤں۔
مگر ایک دانیار تھا جو نہیں ھنسا۔ اتفاق سے اس پر نظر پڑ گئی تو میری ھنسی بھی جاتی رہی۔ وہ اکیلا گاھنے کے ٹھکانے کے ایک طرف ٹانگیں چوڑی کئے کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگا که یه آدمی ابھی جھپٹا مارےگا اور جمیله کو جگیتوں کے پنجے سے چھین لے جائےگا۔ وہ جمیله کو تکے جا رہا تھا رنج کی نظر کے ساتھه، واہوا کی نظر کے ساتھه اور ان نظروں میں شادمانی بھی تھی، درد مندی بھی۔ ھاں، واقعی، جمیله کے حسن میں دانیار کی شادمانی بھی تھی اور دردمندی بھی۔ جب ان کھلنڈڑے جوانوں نے جمیله کو اپنے بازوؤں میں بھینچا اور ایک ایک کو چومنے پر مجبور کر دیا تو دانیار نے گردن جھکا لی اور ایسے کسمسایا که وہ یہاں سے ٹل جائےگا۔ مگر وھیں رہا۔

اتنے میں جمیلہ کی بھی اس پر نظر پڑ گئی۔ ایک دم اس نے ہنسی توڑی اور گردن جھکا لی۔

"بس بہت ہولی بےوقوفی!"، جمیلہ نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے جگیتوں کو جھٹک دیا۔

ان میں سے کسی نے بڑھ کے گلے لگانے کی کوشش کی۔

"خبردار!"، جمیلہ نے اس نوجوان کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ڈانٹا، سر اٹھایا اور آہستہ سے قصوروار کی سی نظر دانیار کی طرف ڈالی اور جھاڑیوں کی سمت چل دی تاکہ کرتہ نچوڑ ڈالے۔

ان دونوں میں کس قسم کے تعلقات تھے، میں ٹھیک سے سمجھہ نہیں پاتا تھا۔ اور یہ بھی اقرار کر لوں کہ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ البتہ نہ جانے کیوں دل کو اچھا نہیں لگتا تھا جب میری نظر میں یہ بات آتی کہ جمیلہ خود ھی تو دانیار سے کتراتی ھے اور خود اس کا ملال کرتی ھے۔ وھی غنیمت تھا کہ بس پہلے کی طرح ہنستی بولتی رھتی اور اس کا مذاق اڑایا کرتی۔ مگر اسی کے ساتھہ ساتھہ جب ھم راتوں کو اپنے گاؤں واپس ھوا کرتے تھے اور دانیار گایا کرتا تھا تو کوئی نامعلوم سی خوشی ھوتی تھی مجھہ کو ان دونوں کی بدولت۔

جب ھمارے چھکڑے گھاٹی سے گزرنے لگتے تو جمیلہ اپنی گاڑی پر بیٹھی رھتی لیکن اسٹیپی سے گزرتے

وقت وہ پیدل چلنے لگتی تھی۔ میں بھی پیدل ہو جاتا کیوں کہ پیدل چلتے میں گانا سننے کا اور ہی لطف ہے۔ شروع میں تو ہم اپنے چھکڑوں سے اتر کر آگے پیچھے ہو لیتے اور خود احساس نہیں ہوتا تھا کہ قدم سے قدم ملائے چل رہے ہیں اور دھیرے دھیرے دانیار کے قریب ہوتے جاتے۔ معلوم نہیں کون سی ایسی قوت تھی جو بےخبری میں ہمیں اس کے قریب کھینچ لے جاتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ اسٹیپی کے اندھیرے میں اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھیں، اس کی آنکھیں دیکھیں — واقعی یہ وہی دانیار گا رہا ہے، روکھا اور لوگوں سے کترانےوالا دانیار؟

اور ہر بار میری نظر جاتی کہ جمیلہ دل کی بیتابی کے ہاتھوں مجبور اور بےاختیار آہستہ آہستہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیتی مگر دانیار کو خبر بھی نہ ہوتی، اس کی آنکھیں بہت دور کہیں لگی ہوتی تھیں، ہاتھ سر کے پیچھے ٹکے ہوتے اور جھکولے کھاتے رہتے۔ آخر جمیلہ کا ہاتھ گر جاتا اور گاڑی کا کنارا تھام لیتا۔ وہ چونک پڑتی، ہاتھ کو زور سے جھٹکتی اور ٹھیر جاتی۔ وہ راستے کے بیچوں بیچ کھڑی رہتی، منہ لٹکا رہتا، اسے دیر تک آگے جاتے ہوئے دم بخود تکا کرتی اور پھر خود روانہ ہوتی۔

بعض اوقات مجھے یوں لگتا تھا کہ جمیلہ اور میں کسی ایک ہی احساس اور ناقابل فہم احساس کی وجہ

سے چونکے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ احساس ایک زمانے سے ہماری روحوں میں قید تھا اور اب اس کے باہر آنے کا وقت آگیا۔

جمیلہ کام میں تو کھو جاتی تھی لیکن سستانے کے لئے جو اتفاق سے چند منٹ ملتے تھے اور ہم دونوں گاہنے کے ٹھکانے ٹھیر جاتے تھے تو اسے کسی کروٹ چین نہیں پڑتا تھا۔ وہ پچھوڑنے پھٹکنے والوں کے پاس چلی جاتی، ان کا ہاتھ بٹانے لگتی، جلدی جلدی چلتے ہاتھوں سے کئی چھاج پھٹک ڈالتی اور پھر ایک دم چھاج پھینک پھانک اٹھ کھڑی ہوتی اور بھوسے کی ٹال کی طرف چل دیتی۔ وہاں ٹھنڈک میں جا کر بیٹھ جاتی اور گویا تنہائی سے ڈر لگتا ہو، مجھے پکارتی:

”اے کیچنے بالا، آؤ، یہاں بیٹھیں گے!“

ہمیشہ مجھے بےقراری رہی کہ دیکھئے اب وہ کوئی نہ کوئی اہم بات منہ سے کہنےوالی ہے۔ اب اپنے دل کی پھانس میرے سامنے نکالےگی لیکن وہ سدا خاموش رہی۔ کچھ کہے سنے بغیر میرا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیتی، نگاہیں کہیں دور ہوتیں اور میرے نوکیلے چبھنے والے بالوں کو سہلایا کرتی اور اپنی گرم گرم کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے چہرے پر ہاتھ پھیرا کرتی۔ میں زانو پر سر رکھے رکھے اس کی صورت تکا کرتا، انجانی پریشانیاں، بےقراریاں اس کی صورت پر بدلی کی طرح چھائی ہوتیں اور مجھے

لگتا کہ اس آئینے میں اپنی صورت پہچان رہا ہوں۔ خود اس کے اندر بھی کوئی طوفان برپا تھا، روح میں کوئی شے سمٹ رہی تھی اور پھٹ پڑنے کو بیتاب تھی اور وہ آپ بھی اس سے سہمتی تھی۔ وہ دل مسوس کے رہ جاتی تھی، کہ خود اپنے سامنے نہ تو اقرار بن پڑتا تھا اور نہ انکار بن پڑتا تھا اس سے کہ وہ محبت میں مبتلا ہو گئی ہے — ٹھیک اسی طرح جیسے میری حالت تھی کہ جی چاہتا بھی تھا اور نہیں بھی چاہتا تھا کہ جمیلہ دانیار سے محبت کرے۔ کچھ بھی ہو آخر تھی تو وہ ہمارے گھر کی بہو اور میرے بھائی کی بیوی۔

مگر اس طرح کے خیالات دم بھر کو آتے اور میں انہیں دل میں جگہ نہ دیتا۔ مجھے تو ان دنوں واقعی اس میں خوب لطف آیا کرتا تھا کہ اس کے ہونٹ دیکھے جاؤں، بچوں کی طرح ادھ کھلے اور نازک ہونٹ! آنکھیں تکے جاؤں، آنسوؤں سے میلی آنکھیں۔ واہ، کیا خوب لڑکی تھی، کیسی حسین تھی، اس کے مکھڑے پر کیا تروتازہ امنگ اور بشاشت برستی تھی۔ ان دنوں میں یہ سب کچھ دیکھتا تو تھا لیکن پوری طرح سمجھتا نہ تھا۔ اور اب اکثر خود سے یہ سوال کرتا ہوں: ممکن ہے محبت بھی اسی طرح کی کوئی امنگ ہو جیسے مصور کی یا شاعر کی امنگ ہوتی ہے۔ جمیلہ کو دیکھ کر میرا یہ عالم ہوتا تھا کہ کھلے اسٹیپی

میں بھاگ جاؤں، شور مچا مچا کے زمین و آسمان کو ہلا دوں اور پوچھوں — بتاؤ، میں کیا کروں۔ یہ جو میرے اندر بےچینی اور خوشی کا سوتا ابلا پڑتا ہے، اور سمجھ میں نہیں آتا، اس پر کیسے قابو پاؤں۔ لگتا ہے کہ ایک بار اس کا جواب بھی مجھ کو مل گیا۔

اپنے معمول کے مطابق ہم لوگ اسٹیشن سے واپس آ رہے تھے۔ رات ہو چلی تھی، آسمان پر ستاروں کی ڈھیریاں جگ مگ کرنے لگی تھیں، اسٹیپی نیند کے لئے پاؤں پسار رہا تھا اور صرف دانیار کا گانا اس سناٹے کو توڑ کر گونج رہا تھا اور دور کہیں نرم و تاریک فضا میں جاکر گم ہو جاتا تھا۔ میں اور جمیلہ اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔

پتہ نہیں اس بار دانیار کو ہو کیا گیا تھا کہ اس کے گانے میں ایسا گداز، ایسا دل کو چھونےوالا غم تھا، ایسی تنہائی کہ ھمارا دل بھر آیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

جمیلہ ایک طرف سر ڈھلکائے اور مضبوطی سے چھکڑے کا کنارا پکڑے چلی جا رہی تھی اور جب دانیار نے پھر سے اپنی آواز اٹھائی اور پنچم کے سر لگائے تو جمیلہ سے نہ رہا گیا، وہ سر جھٹک کر چلتی گاڑی میں کود کر سوار ہو گئی اور دانیار کے پاس جا بیٹھی۔ جمیلہ اپنے سینے پر ھاتھ باندھے بالکل بت بنی بیٹھی تھی۔ میں ان کے قریب پہنچا اور لپکنے میں زرا ان سے آگے

نکل گیا۔ برابر سے میں نے ان پر نگاہ کی، دیکھا کہ دانیار گانے میں محو ہے اور معلوم ہوتا تھا پہلو میں جمیلہ کے ہونے کی خبر تک نہیں۔ میں نے ایک نظر دیکھا کہ اس لڑکی کے ہاتھ نیچے چھوٹ گئے اور ایک زرا اس کی طرف جھک کر جمیلہ نے اس کے شانے پر سر ٹکا لیا۔ بس لمحہ بھر کو دانیار کی آواز سر سے بےسر ہوئی جیسے غلط قدم اٹھنے پر گھوڑے کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اب ہنٹر پڑیگا اور پھر زیادہ جوش سے گونجنے لگی۔ اب وہ محبت کے گیت گا رہا تھا !

میں سناٹے میں تھا۔ یہ لگا کہ اسٹیپی میں بہار آگئی۔ چٹیل میدان سانس لینے لگا۔ اندھیرا کافور ہونے لگا۔ اور لمبے چوڑے میدان میں دو محبت کے مارے مجھے نظر آئے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا، جیسے میں ہوں ہی نہیں۔ میں ان کے چھکڑے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور دیکھتا رہا کہ وہ دونوں ساری دنیا سے بےخبر اس گانے کی دھن پر جھوم رہے تھے۔ میرے لئے ان کا پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ وہی دانیار تھا، اپنی کھلے گریبان کی پھٹی پرانی فوجی قمیص میں۔ مگر اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ اور یہ میری جمیلہ تھی جو اس سے سٹ کر بیٹھی تھی، ایسی چپ چاپ، ایسی شرمائی ہوئی سی اور پلکوں پر بوندیں لئے ہوئے۔ یہ دونوں بالکل

هی نئے آدمی تھے بےپناہ راحتوں میں کھوئے ہوئے۔ کون کہہ سکتا ہے یہ خوشی راحت نہیں تھی؟ وہ تمام کی تمام بے پناہ محبت جو دانیار کو اپنے وطن کی خاک سے تھی، جس نے اس میں یہ پرسوز موسیقی پیدا کر دی تھی، وہ سب اس نے جمیلہ کو دے ڈالی، وہ اسی کی خاطر گا رہا تھا اور اسی کے گیت گا رہا تھا۔

میں پھر اسی ھلچل میں مبتلا ہو گیا جو میری سمجھ سے باہر تھی اور دانیار کے گانے کے ساتھ ھی مجھ پر چھا جایا کرتی تھی۔ ایکا ایکی صاف طور سے سمجھ میں آ گیا کہ میں کیا چاھتا تھا — میں چاھتا تھا ان دونوں کی تصویر بنانا۔

خود اپنے خیالوں سے میں ڈر گیا۔ لیکن تصویر بنانے کی تمنا اس خوف سے زیادہ طاقتور تھی۔ سوچا کہ ان کی تصویر ایسی ھی بناؤں گا کہ دونوں مگن ھیں۔ ٹھیک ایسے جیسے اس وقت موجود ھیں۔ مگر کیا یہ میرے بس کی بات ہے؟ خوف اور خوشی سے میرا سانس رک گیا۔ قدم اس طرح پڑ رہے تھے جیسے مدھوشی طاری ہے۔ میں بھی مگن تھا، کیوں کہ مجھے خود نہیں خبر تھی کہ یہ ترنگ آگے چل کر میری جان پر کیا کچھ ستم توڑے گی۔ میں نے اپنے دل میں کہا: آدمی دھرتی کو ایسے دیکھے جیسے دانیار دیکھتا ہے۔ میں رنگوں سے کام لوں گا اور دانیار کے گیتوں کی تصویر بنا ڈالونگا، میری تصویر میں بھی پہاڑ ہونگے،

اسٹیپی میدان ہوگا، لوگ ہونگے، گھاس ہوگی، بادل ہونگے اور دریا ہونگے۔ یہ بات سوچتے وقت یہاں تک خیال گیا کہ اچھا، سب سہی، مگر رنگ کہاں سے لاؤنگا؟ اسکول‌والے دینگے نہیں، خود انہیں ضرورت رہتی ہے! گویا لےدے کے سارا معاملہ صرف رنگوں کا تھا۔

دانیار کا گانا ایک دم سے ٹوٹ گیا۔ جمیلہ نے بے اختیار اسے اپنے بازوؤں میں لے رکھا تھا لیکن گانے کا سلسلہ ٹوٹنا تھا کہ فوراً ہاتھہ ہٹا لئے۔ دم بھرکو سکتے میں رہی اور پھر چھکڑے سے کود کر اتر آئی۔ دانیار نے ہچکچاہٹ سے گھوڑوں کی لگام کھینچ لی۔ گھوڑوں نے قدم روک لئے۔ جمیلہ اس کی طرف سے منہ پھیرے سڑک پر کھڑی تھی۔ پھر اس نے زور سے سر کو جھٹکا اور کن‌انکھیوں سے دانیار کو دیکھہ کر بمشکل اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی:

"کیا دیکھتے ہو تم؟"، لمحہ بھر ٹھیری اور پھر منہ چڑھا کر بولی: "مجھے مت دیکھو، جاؤ، گاڑی بڑھاؤ آگے!"، یہ کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف ہو لی۔ "اور تم کیا منہ پھاڑے ہو؟"، اس نے مجھے ڈانٹ پلائی۔ "جاؤ بیٹھو اپنی گاڑی پر، راس اٹھاؤ! ناک میں دم ہے تم لوگوں سے!"

"یہ اسے ایک دم کیا ہوا؟"، میں نے گھوڑوں کو ٹخ‌ٹخ کرتے ہوئے اپنے جی میں سوچا۔ اس میں زیادہ دماغ لڑانے کی ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ آخر شوہروالی

عورت تھی۔ اور شوہر کہیں ساراتوف کے ہسپتال میں پڑا تھا۔ مگر میرا دل نہیں مانتا تھا کہ کوئی بات قطعی طور سے سوچ لوں۔ اس لڑکی پر غصہ آ رہا تھا، خود پر جان جل رہی تھی اور ممکن ہے اس سے سخت نفرت ہی ہو جاتی اگر کہیں اس وقت یہ معلوم ہوتا کہ اب دانیار گا چکا، آئندہ اس کا گانا سننا نصیب نہیں ہونے والا۔

بدن اس بری طرح ٹوٹ رہا تھا کہ دم نکلا جاتا تھا۔ بےچینی تھی کہ جلدی سے اپنے ٹھکانے پہنچ جاؤں اور بھوسے پر لیٹ کر ٹانگیں پھیلا دوں۔ رات کے اندھیرے میں دلکی چلتے ہوئے گھوڑوں کی پیٹھیں ہلتی رہیں، چھکڑا اتنی چرخ چوں کرتا رہا کہ برداشت سے باہر اور راس میرے ہاتھ سے پھسلتی گئی۔

جب ہم گاہنے کے ٹھکانے پہنچے تو گھوڑے کھولنا، ساز اتارنا اور اسے چھکڑے میں ڈالنا میرے لئے مصیبت ہوگیا تھا۔ بھوسے تک پہنچ کر میں ڈھیر ہو گیا اور اس بار گھوڑوں کو خود دانیار چرانے لے گیا۔

صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو روح شاد تھی۔ جمیلہ اور دانیار کی تصویر میرے موقلم سے بن کے رہیگی۔ آنکھیں بند کرکے میں نے تصور میں ان دونوں کی تصویر کھینچ بھی لی۔ بس گویا اب برش کی اور رنگوں کی دیر تھی تصویر بنانے میں۔

دوڑا ہوا گھاٹ پر گیا۔ منہ ہاتھہ دھویا اور پچھاڑی بندھے ہوئے گھوڑوں کی طرف دوڑا۔ ٹھنڈی اور گیلی لوسرن میرے ننگے پیروں پر بہت زور سے لگتی تھی اور تلووں کی پھٹی ہوئی کھال کو کاٹے دیتی تھی مگر اس پر بھی مجھے اچھا ہی اچھا لگ رہا تھا۔ دوڑنے میں اپنے چاروں طرف کی ہر چیز کو دیکھتا بھالتا گیا۔ پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج سر اٹھا رہا تھا اور عریق کے پاس جو اتفاق سے ایک سورج مکھی کا پودا جڑ پکڑ گیا تھا وہ سورج کی طرف رخ کر چکا تھا۔ سفید سر کی جھاڑیاں چاروں طرف سے اس پر ٹوٹ پڑیں مگر وہ اپنی جگہ تنا کھڑا رہا۔ سورج کی حرارت اور روشنی لیتا رہا، اپنی زرد زرد زبانوں سے صبح کی کرنیں چاٹتا رہا اور اپنے بیجوں کی ٹھوس اور کسی ہوئی تھیلی کو ان کی غذا دیتا رہا۔ اور عریق سے ہوکر جو لیکھہ بن گئی تھی پانی اس لیکھہ میں ٹوٹ آیا۔ اور وہ بنفشئی جزیرہ کمر کمر کھڑا لہرا رہا ہے اور میتھی کی مہک دے رہا ہے۔ میں اپنی دھرتی، اپنی جنم بھومی پر دوڑا جا رہا ہوں اور میرے سر پر ابابیل اڑ رہے ہیں۔ ہائے کاش رنگ میرے پاس ہوتے تو صبح کے روپہلے منظر کی تصویر کشی کرتا، سفید اور نیلے پہاڑ دکھاتا، اوس میں بھیگی لوسرن دکھاتا اور یہ سورج مکھی کھینچ کر رکھہ دیتا جو سب سے الگ تھلگ ایک عریق کے پاس اگا ہوا ہے۔

جب میں کاھن پر پہنچا ھوں تو خوشی کا موڈ ھی جاتا رھا۔ دیکھا کہ جمیلہ موجود ھے بجھی بجھی۔ چہرے پر اداسی چھائی ھوئی ھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ھیں۔ شاید رات بھر آنکھہ نہیں لگی اس کی۔ مجھہ سے نہ ھنسی، نہ بولی۔ اورعظمت کو آتے دیکھا تو اس کی طرف بڑھی اور سلام دعا کئے بغیر کہنے لگی:

" اپنا چھکڑا مجھہ سے لے لو! جہاں چاھو بھیج دو لیکن اب میں اسٹیشن نہیں جایا کرونگی! "

" کیوں، کیا ھو گیا تجھے جملتائی؟ بھینسا مکھی نے کاٹ کھایا کیا؟ " اورعظمت نے شفقت کے ساتھہ تعجب ظاھر کیا۔

" بھینسا مکھی کاٹتی ھوگی بھینسوں کو۔ مجھے تنگ مت کرو، بس کہہ دیا کہ میں نہیں چاھتی اسٹیشن جانا۔ اور کچھہ نہیں۔ "

اورعظمت کے چہرے سے مسکراھٹ کافور ھو گئی۔

" چاھو یا مت چاھو، اناج تو ڈھونا پڑیگا! " اس نے بیساکھی زمین پر ٹھونک کر کہا۔ " اگر کسی نے تمہیں ٹیڑھی نظر سے دیکھا ھے، بتاؤ، اس کی گردن پر یہی بیساکھی توڑ دونگا۔ اور اگر شکایت نہیں ھے کسی سے تو بےوقوفی مت کرو۔ فوج کو اناج پہنچاتی ھو۔ تمہارا میاں بھی تو وھیں ھے فوج میں۔ "

یہ کہہ کر وہ بالکل گھوم گیا اور بیسا کھی ٹیکتا وہاں سے چل دیا۔

جمیلہ کسمسا کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر رنگ آیا اور دانیار کی طرف نظر کرکے اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ دانیار اس سے زرا ہٹ کر اس طرح کھڑا تھا کہ جمیلہ کی طرف اس کی پیٹھ تھی اور زرا جھٹکے کے ساتھ گھوڑے کا ساز کس رہا تھا۔ جمیلہ کی اورعظمت سے بات چیت اس کے کان میں پڑ چکی تھی۔ جمیلہ زرا دیر وہیں کھڑی رہی اور انگلیوں پر کوڑے کو البیٹ دیتی رہی۔ پھر بیزاری سے ہاتھہ ہلایا اور اپنے چھکڑے کی طرف چل دی۔

اس روز ہم معمول سے زرا پہلے واپس آگئے۔ دانیار راستے بھر گھوڑے دوڑاتا رہا۔ جمیلہ کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے جلا ہوا، خاک سیاہ اسٹیپی پڑا ہے۔ کل تک یہی اسٹیپی بالکل دوسرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی افسانہ سنا تھا اوراب خوشی کی وہ تصویر جس نے میرے ہوش وحواس میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی، کسی طرح دماغ سے نکلتی نہ تھی۔ یوں لگا جیسے میں نے زندگی کا کوئی بہت تیز ٹکڑا تھاما تھا۔ اس کی ایک تفصیل دل ودماغ میں بسا لی اور صرف اسی کی بدولت میں بےقرار ہوں۔ اور اس وقت تک قرار نہ آیا جب تک کہ اناج تولنے والی سے ایک موٹا سا سفید کاغذ نہ

لے لیا۔ وهاں سے دوڑ کر بهوسے کی ٹال کے پیچھے چلا گیا۔ دل ایسے دھڑک رها تها گویا سینے سے نکل جائیگا۔ میں نے یه کاغذ لکڑی کے ایک پهاوڑے کی چکنی پشت پر بچها دیا۔ یه پهاوڑا چلتے چلاتے میں اناج صاف کرنے والوں کے پاس سے لیتا گیا تها۔

” بسم الله کی برکت سے ! ،، میرے منه سے نکلا ٹهیک اسی طرح جیسے میرے ابا نے پهلی بار مجھے گهوڑے پر بٹهاتے وقت کہا تها۔ اور ان لفظوں کے ساتهه کاغذ پر پنسل لگائی۔ یه میری پهلی بےاستادی مشق تهی۔ لیکن جب کاغذ پر دانیار کا ناک نقشه کهینچا هے تو میں دنیا ومافیہا سے بےخبر هوگیا۔ صرف یه لگ رها تها که کاغذ پر اگست کی اس رات کا اسٹیپی هے، میں دانیار کو گانا گاتے سن رها هوں۔ پیچھے سر ڈهلکائے، کهلے گریبان دیکهه رها هوں اور جمیله اس کے کاندهے پر جهکی هوئی هے۔ چهکڑا جا رها هے، چهکڑے پر دونوں بیٹهے هیں، راس آگے چهوٹی هوئی هے، اندهیرے میں گهوڑوں کی پیٹهیں هلتی جاتی هیں اور سامنے اسٹیپی هے اور دور فاصلے پر ستارے هیں۔

میں ایسی مدهوشی سے تصویر بنا رها تها که اپنے آس پاس تک کی خبر نه تهی اور ایک دم کسی کی آواز بالکل میرے سر پر سے آئی تو زور سے چونک پڑا :

” کیا هوا، بهرے هو گئے کیا ؟ ،،

جمیلہ سر پر کھڑی تھی۔ میں شرم سے لال ہوگیا اور تصویر چھپا لینے کی بھی سدھ نہ رہی۔

"چھکڑے کبھی کے لد گئے۔ تمہیں پکار رہے ہیں گھنٹے بھر سے۔ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ اور یہ کیا ہے؟"، یہ کہہ کر اس نے تصویر اٹھالی۔ "ہونہہ، تو!"، اس نے رنج اور غصے سے کاندھے مٹکائے۔

جی چاہا کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں۔ جمیلہ دیر تک اس تصویر کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر میری طرف غمناک اور نمناک نظریں اٹھائیں اور آہستہ سے بولی:

"کیچینےبالا، مجھے دے دو یہ تصویر... نشانی سمجھ کے احتیاط سے رکھونگی..."، اور اس تصویر کو موڑکر تہہ کرکے اپنے بلاؤز میں رکھ لیا۔

اب ہمارے چھکڑے سڑک پر نکل آئے تھے لیکن میں ابھی تک اپنے ہوش میں نہ آسکا تھا۔ جیسے سب کچھ خواب میں دیکھا ہو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ میں نے ہی وہ تصویر بنائی ہے جو آنکھوں دیکھے کسی واقعے سے ملتی جلتی ہے۔ پھر بھی کہیں روح کی گہرائی میں کوئی سادہ و بےنام جذبہ ابھر رہا تھا — کہ ہم نے ایک کارنامہ کیا، بلکہ فخر ہوتا تھا اور ایک سے بڑھ کر ایک خواب، ایک سے بڑھ کر ایک بےتحاشا امنگ نے میرا سر چکرا دیا۔ تمنائیں امنڈ آئی تھیں کہ رنگارنگ

تصویریں بنا بنا کر ڈھیر کر دوں، لیکن پنسل سے نہیں، رنگوں سے۔ اس طرف دھیان تک نہ گیا کہ ہم بہت تیزرفتار سے چلے جا رہے ھیں، یہ حرکت دانیار کی تھی، اس نے گھوڑے اڑا دئے تھے۔ جمیلہ بھی پیچھے نہیں رھی۔ وہ دائیں بائیں دیکھتی جاتی تھی اور باربار مسکراتی تھی دل کو چھونےوالی اور خطاوار کی سی مسکراھٹ کے ساتھہ۔ مجھے بھی ھنسی آ رھی تھی کہ چلو، کم‌ازکم مجھہ سے اور دانیار سے خفا تو نہیں ھے۔ اگر وہ کہیگی تو دانیار آج گاکے رھیگا۔

اس بار ھم اسٹیشن پہنچے تو معمول سے کچھہ پہلے ھی پہنچ گئے۔ گھوڑے پسینے میں شرابور ھو گئے تھے۔ چھکڑے ابھی ٹھیرے بھی نہ تھے کہ دانیارنے بوریاں اتارنی شروع کر دیں۔ نہ جانے کہاں کی جلدی پڑی تھی، اسے کیا ھو گیا تھا۔ جب اسٹیشن کے پاس سے ریل‌گاڑیاں گزرنے لگیں تو وہ ٹھیر گیا اور دیر تک فکرمند نظروں سے انہیں دیکھتا رھا۔ جمیلہ بھی اسی طرف نظریں اٹھائے رھی گویا سمجھنا چاھتی ھو کہ اس کے دماغ میں ھے کیا۔ اور اس نے دانیار کو پکارا :

"ادھر آنا زرا — گھوڑے کا نعل ڈھیلا ھو رھا ھے۔ میرا ھاتھہ بٹا دو اسے نکلوانے میں۔"

اور جب دانیارنے گھٹنوں میں گھوڑے کے سم لے کر ڈھیلا نعل اکھیڑ لیا اور کمر سیدھی کی تو جمیلہ نے اس سے آنکھیں چار کرتے ھوئے کہا :

"کیا ہوا ہے تمہیں ؟ سمجھتے نہیں کیا ؟ یا سارے جگت میں ایک میں ہی رہ گئی ہوں ؟ "

دانیار نے چپ چاپ نگاہیں دوسری طرف کر لیں۔

"کیا سمجھتے ہو کہ مجھ پر کچھ نہیں گزر رہی ؟"

اور یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔

دانیار کی بھویں اٹھیں، اس نے جمیلہ کو محبت اور درد کی نظر سے دیکھا اور کچھ کہا — مگر کہا اتنے آہستہ سے کہ میرے کان میں کچھ نہیں پڑا۔ پھر جلدی جلدی قدم رکھتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس چلا گیا بلکہ کسی بات پر بہت مطمئن نظر آتا تھا۔ چلتے چلاتے اس نے نعل کو دھیرے سے تھپکی دی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا اور غور کرنے پر بھی اندازہ نہ کر سکا کہ وہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ جمیلہ نے کہی اور دانیار کی تسکین ہو گئی۔

بھلا اس میں تسکین یا تسلی کی کون سی بات ہے کہ کوئی گہری سانس لے کر کسی سے کہے "کیا سمجھتے ہو کہ مجھ پر کچھ نہیں گزر رہی ؟"

ہم مال اتار چکے تھے اور اب چلنے کی باری تھی کہ احاطے میں ایک زخمی فوجی داخل ہوا۔ سوکھا مارا آدمی تھا، کوٹ ملادلا اور کاندھے پر سامان کا تھیلا لٹکا ہوا۔ اس سے چند منٹ پہلے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری

تھی۔ اس فوجی نے گاڑی سے اترکر دائیں بائیں نگاہ ڈالی اور پکارکر پوچھا :

" ارے کوئی ہے کورکوریو گڈوں کا ؟ "

" میں ہوں ، کہو " میں نے بڑھ کر جواب دیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ ایسا کون آدمی ہو سکتا ہے۔

" تو کس کا ہے، میرے بھائی ؟ " فوجی نے میری طرف بڑھتے ہوئے سوال کیا۔ اتنے میں جمیلہ پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اور وہ خوشی اور حیرت کے مارے کھل گیا۔

" ارے تم ہو کریم ؟ " وہ پکاری۔

" ہائے — میری بہنا — جمیلہ ہے ! " یہ کہہ کر وہ جھپٹا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ بھینچ لئے۔

معلوم ہوا کہ وہ جمیلہ کے گاؤں کا تھا کوئی۔

" یہ دیکھو قسمت کی بات ! جیسے خبر ہو گئی ہو کہ تم یہاں ہو اور ادھر نکل آیا " اس نے ہماھمی سے کہا۔ " میں سیدھا صادق کے پاس سے آرہا ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی ہسپتال میں ساتھ ساتھ پڑے تھے۔ انشاء اللہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں گھر آ جائیگا۔ جب میں چلنے لگا تو اس سے کہا " خط وط دینا ہو تو دے دے بیوی کے نام "۔ تو یہ تمہاری چٹھی لایا ہوں ویسی کی ویسی ہی احتیاط اور حفاظت سے " اور کریم نے تکونا لفافہ جمیلہ کے حوالے کیا۔

جمیلہ نے خط لے لیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا، ایک گیا۔ اور پھر کن انکھیوں سے اس نے دانیار کو اندیشے کے ساتھہ دیکھا۔ وہ جوں کا توں چھکڑے سے لگا کھڑا تھا۔ جیسے اس روز سب سے الگ تھلگ ٹانگیں چیرے ہوئے موجود تھا، آنکھوں پر اداسی چھائی ہوئی تھی اور جمیلہ کو تکے جا رہا تھا۔

اتنی دیر میں سب طرف سے لوگ لپک کر آگئے۔ ان میں اس فوجی کے دوست تھے، رشتہ‌دار تھے اور سبھوں نے اس پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ ابھی جمیلہ خط لانے کا شکریہ بھی ادا کرنے نہ پائی تھی کہ دانیار کا چھکڑا کھڑکھڑاتا ہوا اس کے برابر سے نکلا، احاطے سے باھر پہنچا اور دھچکے کھاتا ہوا سڑک پر غبار اڑانے لگا۔

" کچھہ پگلا گیا ھے کیا ؟ "، پیچھے سے لوگوں نے ڈانٹا۔

اس فوجی کو لوگ کسی طرف لے گئے۔ میں اور جمیلہ احاطے کے درمیان کھڑے رہ گئے اور گردوغبار کے بادلوں کو چھٹتے دیکھتے رہے۔

" چلیں بھابی "، میں نے کہا۔

" جاؤ، چلے جاؤ۔ مجھے اکیلا رہنے دو ! "، زرا گرم ہوکر اس نے کہا۔

چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم الگ الگ روانہ ہوئے۔ گرم ہوا کے مارے سوکھے ہونٹ جلنے لگے۔

دن بھر تپش سے زمین کی کھال ادھڑ گئی تھی اور اب بخار نکل رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس پر نمکین پپڑیاں جمی رہ گئی ہیں۔ ڈوبتا ہوا بےڈول سورج بھی اسی نمکین اور سفید دھند میں تھرتھرا رہا تھا۔ دھندلے افق پر نارنجی رنگ کے طوفانی بادل سمٹ کر آ رہے تھے۔ خشک ہوا کے جھکڑوں سے گھوڑوں کی تھوتھنی پر سفید سفید مٹی کی تہہ چڑھی جاتی تھی۔

"کیا بارش کے آثار ہیں؟" میں نے سوچا۔ اندر سے تنہائی لگ رہی تھی مجھ کو اور وحشت معلوم ہوتی تھی۔ گھوڑوں کی چال ڈھیلی پڑ گئی تھی، میں نے ان کے ہنٹر رسید کیا۔ لمبی ٹانگوں والے سوکھے مارے تغدار کہیں لپکے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں گوکھرو کی سوکھی پتیاں اڑی پھرتی تھیں۔ ہمارے علاقے میں تو اس طرح کے گوکھرو نہیں ہوتے ہیں، قزاخوں کی طرف سے اڑ کر آئے ہونگے۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف دھوپ کا مارا تھکا تھکایا اسٹیپی تھا۔ اور بس۔

جب میں گاھنے کے ٹھکانے پہنچا تو اندھیرا ہوچکا تھا۔ ہوا ساکت و ساکن تھی۔ میں نے دانیار کو آواز دی—

"دریا کی طرف گیا ہے" پہرے والے نے جواب دیا۔ "امس کیسی ہے۔ ہوا کا نام نشان نہیں۔ سب اپنے اپنے

گھر چلے گئے۔ ھوا کا جھونکا نہ ھو تو کاھنا پچھوڑنا کس کا ! ،،

میں نے گھوڑوں کو چرنے چھوڑ دیا اور خود دریا کی طرف ھو لیا۔ مجھے پتہ تھا کہ دریا کے کگارے کے پاس اس کا خاص ٹھکانا ھے۔ وھیں ھوگا۔

وہ وھیں گھٹنوں پر سر رکھے، جھکا ھوا بیٹھا تھا اور نیچے پانی کا شراٹا سنے جا رھا تھا۔ جی چاھا کہ اس کے پاس پہنچوں، بازوؤں میں بھینچ لوں اور کوئی پیار کی بات کہوں۔ مگر کہتا بھی تو کیا کہتا۔ آخر ایک طرف کھڑے کھڑے الٹے پاؤں چلا آیا۔ آ کر میں نے ھاتھہ پاؤں پھیلا دئے۔ دیر تک پیال پر لیٹا، بادلوں سے گھرتے ھوئے آسمان کو تکتا رھا اور سوچتا رھا کہ زندگی اس قدر الجھی ھوئی کیوں ھے اور اس کا سمجھنا اتنا مشکل کیوں ھے۔

جمیلہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ کہاں الجھہ گئی ؟ تھکن سے سارا بدن چور تھا مگر آنکھہ نہیں لگی۔ پہاڑوں کے اوپر بادلوں کے اندر بجلی تڑپی۔

جب دانیار گاھن پر واپس آیا تو میں جاگ رھا تھا۔ پہلے تو یوں ھی ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرا اور سڑک کو انتظار کی نگاہ سے دیکھتا رھا پھر خود بھی پیال پر پاؤں پسار دئے۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ اب یہ شخص ٹھیرنے والا نہیں ھے، گاؤں سے چل دیگا۔ مگر جائےگا کہاں ؟ کوئی ٹھکانا نہیں، کہیں کسی کو اس کا انتظار

نہیں۔ میں اونگھہ چلا تھا کہ دور سے آتے ہوئے چھکڑے کی کھڑکھڑ سنائی دی۔ غالباً جمیلہ واپس آ رہی تھی...

معلوم نہیں کب تک نیند میں رہا کہ اتنے میں کان کے پاس بھوسے کے تنکے سرسرائے، قریب سے کسی کی آہٹ ہوئی اور لگا کہ بھیگا ہوا بازو میرے شانے کو چھو رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ جمیلہ موجود تھی۔ دریا سے آئی تھی۔ کپڑے ابھی تک ٹھنڈے اور پانی میں زرا بھیگے ہوئے تھے۔ وہ رکی، بےچینی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور دانیار کے پہلو میں بیٹھہ گئی۔

" دانیار، میں آ گئی۔ میں خود سے ھی آگئی " اس نے دھیمے سے کہا۔

چاروں طرف سناٹا تھا۔ فضا بےآواز تھی۔ آسمان سے نیچے بجلی اتر پڑی لیکن کڑک نہیں ہوئی۔

" کیا مجھہ سے خفا ہو ؟ بہت خفا ہو تم ؟ "

پھر خاموشی۔ بس مٹی کا ایک کھلا ہوا ڈھیلا پھسل کر پانی میں جا ملا۔

" کیا یہ سب میری خطا ہے؟ اور تم بھی تو بےقصور ہو... "

پہاڑوں پر بجلی کڑکی۔ اور بجلی کی آنا فانی چمک میں جمیلہ کا ناک نقشہ ایک رخ سے صاف ابھرا۔ وہ دانیار سے چمٹ گئی اور اس کے بازوؤں کی گرفت میں

بے اختیار سانسوں کا اتار چڑھاؤ بڑھ گیا۔ ٹانگیں پھیلا کر وھیں اس کے پہلو بہ پہلو لیٹ گئی۔

اسٹیپی سے لو کا جھونکا آیا۔ بھوسے نے چکر کھائے اور گاھنے کے ٹھکانے پر جو ایک طرف پھٹی پرانی چھولداری پڑی تھی اس میں بھوسے کا بگولا جا لگا اور سڑک پر دھول کا چکر بن گیا۔ پھر بادلوں میں گرج ہوئی، بجلی کڑکی اور کڑک کے ساتھ نیلا شعلہ سا بادلوں کو چیر گیا۔ دھشت بھی ھوتی تھی اور طبیعت بھی مچلتی تھی — طوفان کی آمد تھی، گرمیوں کے موسم کا آخری طوفان آرھا تھا۔

”کیا سمجھے تھے کہ میں تمہیں چھوڑ کر اسے پسند کرونگی؟“ جمیلہ نے دل کی آگ کے ساتھ دبی زبان سے کہا۔ ”ھرگز نہیں! اسے مجھ سے کبھی محبت نہ تھی۔ سلام دعا بھی میرے نام کی لکھتا ھے تو خط کے بالکل آخر میں لکھتا ھے۔ مجھے اس کی گئی گزری محبت نہیں چاھئے۔ کہنے دو لوگوں کو، جو جی میں آئے۔ بچارے میرے اکیلے، میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی! بہت دنوں سے تمہیں چاھتی ھوں۔ مجھے تم سے محبت ھے اور جب تمہیں بالکل جانتی بھی نہیں تھی تب سے چاھتی ھوں۔ تمہارا انتظار تھا دل کو اور تم ایسے آ گئے جیسے تمہیں میرے اس انتظار کی خبر ھو!“

نیلی نیلی بجلیاں دریا میں آگے پیچھے تڑپ کر گریں اور بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپاٹپ بھوسے پر پڑنے لگیں۔

"جمیلہ، میری جان جملتائی !"، دانیار نے اسے قزاخوں اور قرغیزوں کے سارے پیار کے ناموں سے پکارنا شروع کیا۔ "جان، میں بھی ایک زمانے سے تجھے چاہتا ہوں۔ جب میں لام پر تھا تو خندقوں تک میں تیرا تصور ساتھ رہتا تھا اور میں جانتا تھا کہ میری جان وطن میں پڑی — تم، میری جمیلہ — تم !"

"زرا منہ ادھر کرو ۔ تمہاری آنکھوں میں تو جھانکوں !"

طوفان ہمارے سر پر آچکا تھا۔

چھولداری پر اوپر کا نمدا، جو بھیگ چکا تھا پانی اور ہوا میں زخمی چڑیا کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ بارش پر ہوا کے کوڑے پڑ رہے تھے اور وہ زوروں میں زمین پر ٹوٹ رہی تھی گویا دھرتی کو پیار کر رہی ہو ۔ آسمان پر ادھر سے ادھر تک وہ گرج تھی کہ معلوم ہوتا تھا طوفان پھٹ پڑا ہے۔ بجلی لالہ کے سرخ پھول کی طرح زرا زرا دیر سے چمکتی تو پہاڑوں پر روشنی ہو جاتی۔ ہوا کی شائیں شائیں نے ساری فضا میں آفت برپا کر رکھی تھی۔

بارش ہو رہی تھی اور میں بھوسے میں دبا چھپا اس طرح پڑا تھا کہ ہاتھ سینے پر تھا اور ہاتھ کے نیچے دل دھڑک رہا تھا۔ مجھے خوشی تھی۔ جی کو ایسا لگتا تھا جیسے ایک زمانے تک بیمار پڑے رہنے کے بعد کوئی باہر دھوپ میں نکلا ہو ۔ بارش کی

بوندیں اور بجلی کی کڑک، دونوں اندر پیال میں بھی مجھ تک پہنچ رہی تھیں لیکن دل کو قرار تھا اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ مجھے اب اس سے غرض نہیں رہی تھی کہ یہ جو آوازیں سن رہا ہوں یہ بارش کے تھمنے کی ہیں یا دانیار اور جمیلہ میں سرگوشی ہو رہی ہے۔

بارش کے دن آ رہے ہیں، خزاں آنےوالی ہے۔ ہوا میں خزاں کے درخت کی سیلی ہوئی بو اور گیلے بھوسے کی سوندھی مہک بسی ہوئی تھی۔ خزاں میں ہمیں کیا واقعہ پیش آئیگا؟ میں نے نہ جانے کیوں اس پر سوچا تک نہیں۔

دو سال مجھے اسکول چھوڑے ہوئے ہو گئے تھے۔ اس خزاں کے موسم میں پھر اسکول جانا شروع کر دیا۔ جب پڑھائی ہو چکتی تو میں اکثر دریا کی ڈھلوان پر پہنچتا اور گھاٹ کے ٹھکانے پر بیٹھ جاتا جہاں نہ آدم تھا نہ آدم‌زاد۔ یہیں پر میں نے اپنی اول اول تصویریں بنائیں۔ اور اچھی طرح یاد ہے کہ تب بھی مجھے معلوم تھا کہ یہ تصویریں بالکل عمدہ نہیں ہیں۔

”رنگ ہی کچھ کام کے نہیں۔ اچھے عمدہ رنگ ہوتے تو بات بنتی!“، میں اپنے آپ سے کہتا، اگرچہ خود واقف نہیں تھا کہ رنگ کیسے ہونے چاہئیں تھے۔ کہیں بہت بعد میں جا کر مجھے پتہ چلا کہ روغنی رنگ کے ٹیوب بھی ہوتے ہیں۔ خیر، رنگ تو رہے ایک طرف،

لیکن میرے استاد ٹھیک ھی کہتے تھے ــ مجھے ابھی تو فن سیکھنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ سب خواب و خیال کی باتیں تھیں۔ بھلا اس کی نوبت کہاں آتی جب کہ میرے بھائیوں کی اب تک کوئی خیر خبر نہ تھی۔ ایسے میں ماں مجھے گھر سے بھلا کیسے چلے جانے دیتیں کہ ایک ھی تو میں بیٹا رہ گیا تھا ان کے پاس، " جگیت اور دو دو گھرانوں کےلئے کمانےوالا "۔ میری تو ھمت بھی نہیں ھو سکتی تھی کہ اماں سے اس پر کچھہ کہوں سنوں۔ اور اوپر سے پت جھڑ کا موسم آیا تو کس غضب کا، کیسا خوبصورت کہ کہیے، میری ھی تصویر بنائے جاؤ۔

کورکوریو کا ٹھنڈا پانی اتھلا ھو گیا۔ پانی میں سے پتھر اوپر کو نکل آئے جن پر گہری سبز اور نارنجی کائی جمی ھوئی تھی۔ صبح سویرے کی ھلکی یخ سے بید کی جھاڑیاں کتھئی ھونے لگیں مگر شیشم پر زرد موٹے موٹے پتے ابھی تک باقی تھے۔

بارشوں کی دھلی ھوئی، دھوئیں دار چھولداریاں، جن میں گڈریے رہتے تھے، نشیب کی مرجھائی ھوئی گھاس میں دھندلا گئی تھیں۔ اور ان چھولداریوں کے اوپر کے روشن‌دانوں سے سرمئی رنگ کا دھواں لہراتا، ھوا میں بل کھاتا اٹھہ رہا تھا۔ خزاں کی ٹھنڈی ھوا میں چھریرے بچھیروں کی زور زور سے ھنہناھٹ گونج رھی تھی۔ بچھیریاں ادھر ادھر بھاگی جا رھی تھیں اور اب

انہیں بہار کے موسم تک ریوڑ میں رکھنا مشکل تھا۔ جو مویشی پہاڑوں سے اتر کر آئے تھے ان کے جھنڈ ڈنٹھلوں میں منہ مارتے پھرتے تھے۔ اور ان کے کھروں کے نشانوں سے جڑیلی اور سرمئی زمین بالکل روند گئی تھی۔

اتنے میں اسٹیپی کی ہوا چلنے لگی۔ آسمان گدلا ہو گیا اور ٹھنڈی بوندیں جو برف کی آمد کا پتہ دیتی ہیں، ٹپاٹپ شروع ہو گئیں۔ ایک روز جب خاصا اچھا دن تھا، میں دریا کی طرف گیا۔ ایک دھکتی ہوئی جھاڑی دیکھ کر میں اس طرف بڑھ گیا۔ یہ جھاڑی ریت کی باڑھ پر اٹھی ہوئی تھی۔ میں بید کی جھاڑی کے پاس ہی گھاٹ کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ دن ڈھلتا جا رہا تھا۔ اچانک دو آدمیوں پر نظر پڑی جو شاید گھاٹ اتر چکے تھے۔ یہ تھے دانیار اور جمیلہ، میری نگاہیں ان پر جم گئیں۔ دونوں کے چہرے پر فکر بھی تھی اور عزم بھی۔ دانیار کے کاندھے سے کرمچ کا وہی تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ وہ تیز قدموں چلا جا رہا تھا اور فوجی کوٹ کا دامن پھٹاپھٹ اس کے پرانے گھٹنوں تک کے جوتوں پر پڑ رہا تھا۔ جمیلہ نے سر پر سفید رومال باندھ رکھا تھا جو زرا سرک گیا تھا۔ اس نے اپنا چھینٹ کا سب سے بڑھیا کرتہ پہن رکھا تھا جو وہ میلوں ٹھیلوں کے دن شوق سے پہنا کرتی تھی۔ اور اوپر سے موٹے ڈوریے کی مرضئی ڈانٹ رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں اس کے کوئی پوٹلی سی تھی،

دوسرا دانیار کے تھیلے کے ایک تسمے کو تھامے ہوئے تھا۔ دونوں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

وہ گھاٹی میں سے ہوکر راستے راستے ہو لئے اور چاروں طرف نوکیلی گھاس کے جھنڈ کھڑے تھے۔ میں ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ سمجھ میں نہ آیا کروں کیا۔ جی میں آیا، ایک ہانک لگاؤں لیکن نہیں، زبان تالو سے لگ گئی۔

شام کی لالی ان بادلوں میں بہہ گئی جو پہاڑوں پر سے تیزی کے ساتھ گزر رہے تھے۔ اور ایک دم اندھیرا ہونے لگا۔ دانیار اور جمیلہ دونوں ریل کی پٹری کی طرف ایسے روانہ ہوئے کہ انہوں نے مڑکے دیکھا تک نہیں۔ دو ایک بار ان کے سر جھاڑیوں میں ابھرتے نظر آئے لیکن پھر بالکل ہی اوجھل ہو گئے۔

"جمی — لا !" میں نے خوب گلا پھاڑکے آواز دی۔

"لا — آ —" دور سے بازگشت کی آواز سنائی دی۔

"جمی — ی — لا !" میں نے پھر زور سے آواز دی اور دریا پار دیوانوں کی طرح دوڑا۔

برفیلی بوندوں کے ہلکے چھینٹے میرے منہ پر پڑے۔ کپڑے بھیگ گئے مگر میں دوڑتا چلا گیا۔ اور کہاں پاؤں پڑ رہا ہے، یہ بھی نہیں دیکھا۔ پاؤں غلط پڑا اور میں اوندھے منہ گرا۔ سر اٹھائے بغیر دیر تک یوں ہی پڑا رہا اور آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اندھیرا آسمان سے میرے شانوں پر اترتا چلا

آ رہا ہے۔ نوکیلی گھاس کی باریک پتیاں سرسرا رہی تھیں اور میرے دکھ کی شریک نظر آ رہی تھیں۔ ان کی سرسراہٹ میں درد تھا۔

" جمیلہ ! جمیلہ ! "، میں نے سبکتے ہوئے کہا۔ اور اس طرح دنیا میں اپنے دو سب سے پیاروں کو، سب سے چہیتوں کو رخصت کر دیا۔ زمین پر پڑے پڑے میں ایک دم اس نتیجے پر پہنچا کہ جمیلہ سے مجھ کو محبت تھی۔ ھاں، واقعی وھی میری پہلی محبت تھی — میرے بچپن کی محبت۔

بہت دیر یوں ھی زمین پر پڑا رہا۔ بازو اشکوں میں تر تھا اور سر بازو میں دبا ھوا۔ اس وقت میں صرف جمیلہ اور دانیار کو ھی خدا حافظ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اپنے بچپن کو بھی رخصت کر رہا تھا۔ خدا حافظ میرے بچپن !

جب رات کے اندھیرے میں چھپا ھوا گھر پہنچا تو دیکھتا کیا ھوں کہ احاطے میں ایک ھنگامہ برپا ہے۔ گھوڑوں کے ساز بج رہے تھے، لوگ زینیں کس رہے تھے اور ایک شرابی عثمان اپنے گھوڑے پر سوار اسے ادھر سے ادھر موڑتا تھا اور دھاڑتا جاتا تھا :

" اس آوارہ کتے کو پہلے ھی گاؤں سے نکال باھر کرنا چاھئے تھا۔ سارے خاندان کے نام کو بٹہ لگایا۔ میرے ھاتھ پڑ جائے، وھیں جان سے مار دوں۔ بلا سے بعد میں عدالت کیا کریگی۔ میں نہیں برداشت

کر سکتا کہ کوئی آوارہ آدمی ہماری بہو بیٹی اڑا کر لے جائے۔ بس، اب دیر نہ کرو۔ جگیت جوانو، رکب میں پاؤں ڈالو، بچ کر کہاں جائیگا، اسٹیشن تک دھر لینگے۔ ''

میرا یہ حال ہو گیا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ کس سڑک سے یہ لوگ اسٹیشن جائیں گے؟ ایک یقین تھا کہ وہی بڑی سڑک پکڑینگے اور پگڈنڈی کا راستہ نہیں لینگے۔ اور اس یقین کے بعد اطمینان ہو گیا تو میں چپکے سے اپنے گھر میں چلا گیا اور ابا کے بھیڑ کی کھال والے کوٹ میں دبک کر میں نے سر تک چھپا لیا تاکہ میرے آنسوؤں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

اس کے بعد گاؤں میں کیا کیا باتیں نہ ہوئیں! عورتوں نے جمیلہ کو کوسنے میں ایک دوسرے کو گھٹا دیا۔

'' کیا الٹی عقل کی نکلی۔ ایسے خاندان سے چلی گئی اور اپنے عیش آرام کو ملیامیٹ کر لیا۔ ''

'' بھلا پوچھو، کاہے کو بدنامی مول لی اس لونڈیا نے۔ ''

'' خیر کچھ نہیں، بعد میں آنکھیں کھلیں گی سجنی کی۔ ''

'' لو، اور سنو، بھلا اپنے صادق میں کیا کمی ہے؟ کچھ برا کماؤ ہے کیا؟ گاؤں میں سب سے بڑھ کے جگیت ہے صادق! ''

" اور ساس؟ ایسی ساس خدا کس کس کو دے۔ بی بی جی جیسی ساس، چراغ لےکے ڈھونڈھو تو نہ ملے۔ خود کو تباہ کر لیا چھوکری نے — بھلا فضول میں نا!"

شاید ایک میں ھی رہ گیا تھا جس نے اپنی بھابی جمیلہ کے حق میں برا لفظ نہیں کہا۔ میں خوب جانتا تھا کہ دانیار اپنی طبیعت سے اتنا مالا مال ھے کہ ھم میں کوئی بھی اس کے برابر کا نہیں نکلے گا۔ میں سوچ بھی نہیں تھا کہ جمیلہ ایسے آدمی کے ساتھہ ناخوش رھے گی۔ مگر ھاں اماں کی وجہ سے افسوس ھو رھا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جمیلہ کے گھر سے نکل جانے پر اماں کی وہ پہلے کی سی طاقت بھی جاتی رھی۔ اماں بالکل لٹک گئیں اور ان کا وہ رکھہ رکھاؤ بھی نہ رھا۔ اب جاکر میں سمجھا ھوں کہ اماں اس بات کو ماننے کے لئے ھرگز تیار نہیں تھیں کہ تقدیر پرانے بندھنوں کو اس زور سے توڑ سکتی ھے۔ اگر پرانے درخت کو طوفان جڑ بنیاد سے ھلا دے تو وہ پھر قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ پہلے یہ ھوتا تھا کہ اماں اپنی شان کے مارے کبھی کسی سے نہیں کہتی تھیں کہ سوئی میں زرا تاگا پرو دینا۔ مگر ایک روز میں اسکول سے آیا تو دیکھا کہ اماں کے ھاتھہ کانپ رھے تھے، سوئی کا ناکا آنکھوں سے نہیں سوجھتا تھا اور وہ رو رھی تھیں۔

" لینا، زرا تاگا پرو دینا، لڑکے"، انہوں نے مجھہ سے

التجا کی اور گہری سانس لی۔ "جمیلہ کا کیا اس کے آگے آئیگا؟ اچھی گرہستن ہوتی وہ۔ مگر چلی گئی۔ ہمیں چھوڑ کر چل دی۔ کیوں نکل گئی ؟ کیا مصیبت تھی اسے ہمارے پاس ؟"

جی چاہتا تھا کہ اماں کے گلے سے لگ جاؤں، انہیں مناؤں سمجھاؤں کہ دانیار کس قسم کا آدمی تھا۔ لیکن میری ہمت نہیں پڑی کیونکہ اگر میں کہتا سنتا تو ان کا دل زندگی بھر دکھتا رہتا۔

لیکن اس معاملے میں جو میری بے قصور کارگزاری تھی، ایک روز آخر وہ کھل کر سامنے آگئی۔ اور سب کو پتہ چل گیا۔

صادق ہسپتال سے گھر آگیا تھا۔ اسے قدرتی طور پر افسوس تو ضرور ہوا لیکن بیٹے ہوئے ایک دن عثمان سے کہنے لگا :

"چلی گئی، بلا سے چلی گئی تو۔ کہیں مر رہے گی۔ ہمیں کیا کمی۔ عورت بہت۔ کوئی سنہرے بالوں‌والی بھی آ جائے تو ہم میں سے سب سے تھرڈ کلاس کے قابل نہیں ہے۔"

"پکی بات ہے جی"، عثمان نے جواب دیا۔ "افسوس رہے‌گا وہ پاجی اس دن میرے ہاتھ نہیں لگا — ورنہ جان سے مار دیتا۔ اور کیا، اس لونڈیا کے جھونٹے گھوڑے کی دم سے باندھ لیتا۔ جانوں کہیں جنوب کو نکل گئے دونوں کپاس میں۔ اور تعجب نہیں جو

قزاخوں کی طرف چل دئے ہوں۔ اسے کیا، اس پر تو آوارگی پہلے ہی سے سوار تھی۔ بس جی، عقل کام نہیں کرتی۔ یہ سب ہو کیسے گیا؟ اور جاننے کو یہ ہے کہ خبر کسی کو نہ لگی۔ خیال تک نہیں گیا ادھر کو۔ یہ سب اس لونڈیا کے کرتوت ہیں، اسی نے سارا کھیل رچا ہوگا۔ میں تو اس کو زندہ ...،،

اس قسم کی باتیں سن کر میرا دل چاہتا تھا کہہ دوں ''ہمیشہ یاد رہیگا کہ کیسے وہ تمہارا مان رکھتی تھی کھیتوں کی کٹائی کے وقت۔ مگر تم گھٹیا طبیعت کے آدمی ہو!،،

ایک روز گھر بیٹھا اسکول کے اخبار کے لئے تصویر بنا رہا تھا۔ اماں کچھ چولھے کے کام میں تھیں۔ اتنے میں صادق کمرے میں بھڑ سے گھس آیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑا تھا۔ غصے کے مارے آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ ایک کاغذ ہاتھ میں تھا جو اس نے میری ناک کے نیچے ٹھونس دیا:

''یہ تیری حرکت ہے؟،،

مجھے سکتہ ہو گیا۔ ہاں، یہ وہی پہلی نقاشی تھی میری۔ دانیار اور جمیلہ اس کاغذ پر سے مجھے یوں تک رہے تھے گویا سچ مچ کے ہوں۔

'' ہاں۔ میری ہے۔ ،،

'' کون ہے یہ؟ ،، اس نے کاغذ پر انگلی گڑو کر پوچھا۔

”دانیار ہے۔ “
”دھوکہباز! “ صادق غصے سے دھاڑا۔ کاغذ پھاڑکے پرزے پرزے کر دیا اور خود دھڑ سے دروازے کے پٹ بھیڑکر باھر نکل گیا۔
بہت دیر جان لیوا خاموشی رہی۔ پھر اماں نے پوچھا :
”تمھیں پھلے سے خبر تھی اس بات کی؟ “
”ھاں، تھی تو۔ “
اماں چولھے کی دیوار کا سہارا لئے، گردن نہوڑائے کھڑی رہ گئیں اور مجھے افسوس اور ملامت کی نظر سے دیکھتی رہیں اور جب میں نے کہا ”یہ تصویر میں پھر بناؤں گا! “ تو انھوں نے چپ چاپ سر ھلایا غم سے۔
میں نے دیکھا کہ کاغذ کے پرزے فرش پر بکھرے پڑے ھیں۔ یہ منظر میری برداشت سے باھر تھا۔ اور دیکھہ کر دم گھٹا جاتا تھا۔ اچھا، مجھے دھوکہ باز سمجھتے ھیں توسمجھا کریں۔ بھلا میں نے کسے دھوکا دے دیا؟ خاندانوالوں کو؟ اپنے عزیزوں کو؟ مگر میں نے سچائی کو، ایمانداری کو، حقیقت کو تو دھوکا نہیں دیا۔ ان دونوں جانوں کی سچائی کو تو دھوکا نہیں دیا۔ مگر یہ بات زبان سے نکالنی محال تھی کیوں کہ خود میری اماں کی سمجھہ میں نہ آتا۔
آنکھوں میں سب کچھہ پھر گیا۔ معلوم ھوتا تھا یہ تصویر کے پرزے نہیں ھیں بلکہ زندہ وجود ھیں جو

فرش پر گھوم رہے ہیں۔ کاغذ میں سے دانیار اور جمیلہ کی تصویر کا مجھے دیکھنا ان کی یاد دلانے کو، انہیں نظروں کے سامنے لانے کو کافی تھا۔ یوں لگا کہ دانیار گا رہا ہے، میں سن رہا ہوں۔ اور وہی اگست کی یادگار رات ہے۔ وہی گانا ہے۔ جب گاؤں سے ان کا سدھار جانا یاد آتا تو میرے اندر بھی ہوک اٹھتی کہ گاؤں سے اسی سڑک پر نکل چلو۔ جی کہتا میں بھی اسی طرح ہمت سے، قدم جماکے چلوں اور راحت کی منزل کو جانےوالے دشوار راستے پر لگ جاؤں۔

''اماں، میں پڑھنے جانا چاہتا ہوں۔ ابا سے کہہ دو تم۔ مجھے فنکار بننا ہے،، میں نے زور دے کر ماں سے کہا۔

میں خوب جانتا تھا کہ اماں مجھے ڈانٹیں ڈپٹیں گی، روئیں گی، میرے بڑے بھائیوں کو یاد کر کرکے آنسو بہائیں گی جو میدان جنگ میں کام آئے۔ مگر تعجب کہ انہوں نے آنسو نہیں بہائے۔ بہت دھیرے سے، رنج کے ساتھ صرف اتنا کہا:

''اچھا، سدھارو، بڑے ہو گئے تم لوگ، پر پھٹ پھٹائے، اڑ گئے۔ ہمیں کیا معلوم، اونچے اڑوگے کہ نہیں؟ ممکن ہے تمہی ٹھیک ہو۔ جاؤ، سدھارو۔ ممکن ہے اڑنے کے بعد کچھ سوچو۔ یہ کوئی دھندا تھوڑئی ہے کہ تصویر کھینچ لی، رنگ بھر دئے۔ پڑھو لکھو، خود معلوم ہو جائیگا۔ بس اپنے گھر کو بھلا مت دینا۔،،

اس دن کے بعد سے چھوٹا مکان ہم سے الگ ہو گیا۔ اور چند روز بعد میں بھی گھر سے نکل آیا۔

کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

جب میں نے آرٹ اسکول کا آخری امتحان پاس کر لیا تو میرا نام اوپر بھیج دیا گیا اکادمی میں کام کرنے کے لئے۔ اور ڈپلوما کے سلسلے میں وہ تصویر قبول کی گئی جس کا خواب برسوں سے دیکھ رہا تھا۔ آسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہی تصویر تھی جمیلہ اور دانیار کی۔ دکھایا یہ گیا ہے کہ اسٹیپی پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سے سڑک جاتی ہے، خزاں کا موسم ہے۔ وہ دونوں اس سڑک پر جا رہے ہیں اور نظروں کے سامنے دور دور پھیلا ہوا روشن افق ہے۔

اگرچہ یہ تصویر لاجواب یا بےعیب نہیں ہے کیوں‌کہ ہنر ایک دم آدمی کے ہاتھ نہیں آ جاتا، پھر بھی میں اسے سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ مجھے یہ تصویر عزیز ہے، یہ میرا پہلا تجربہ ہے کوئی فنی چیز پیش کرنے کا۔

ایسا اکثر ہوتا ہے کہ میں اپنے کام سے خود کو مطمئن نہیں پاتا۔ ایسے بھی دشوار لمحے آتے ہیں جب اپنے پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ ایسے لمحوں میں یہ تصویر دل کے سامنے رکھتا ہوں، یہ تصویر جو مجھے بہت عزیز ہے۔ دانیار اور جمیلہ کا خیال زیادہ آنے لگتا ہے۔ میں انہیں دیکھتا ہوں اور تصور میں ان سے باتیں کرتا ہوں۔

”اب تم کہاں ہو؟ کن راہوں پر چلے جا رہے ہو؟ آجکل ہمارے ہاں اسٹیپی میں بہت سے نئے نئے راستے کھل گئے ہیں — التائی اور سائبیریا تک سارے قزاخستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان علاقوں میں بہت سے دل گردےوالے محنت کر رہے ہیں۔ شاید تم بھی وہیں کہیں ہوگے۔ میری پیاری جمیلہ، تم تو ایسی گئیں کہ مڑکر بھی نہ دیکھا۔ کہیں تم تھک تو نہیں گئیں؟ کہیں اپنے پر سے تمہارا بھروسہ تو نہیں اٹھ گیا؟ دانیار کے شانے پر سر جھکا دو۔ زرا گائے تو وہی پریم کا گیت، دھرتی کا گیت، زندگی کا گیت۔ سارے اسٹیپی میں اس گیت سے نکھار آجائے اور رنگا رنگ کلیاں کھل جائیں۔ ہاں تم پھر وہی اگست والی رات تو یاد کرو۔ چلتی رہو جمیلہ، دل میں ملال نہ لانا — تم نے اپنی خوشیوں کی کٹھن منزل پالی ہے!“

میں تصویر میں ان کی صورت دیکھتا ہوں اور دانیار کی آواز کان میں پڑتی ہے۔ وہ مجھے بھی چل کھڑے ہونے کو کہہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ ”چل باندھ کمر، تیار ہو!“ میں نکلوں گا، اسٹیپی میں اپنے گاؤں کو جاؤں گا۔ وہیں مجھے نئے رنگ ملینگے۔

اچھا ہے، میرے برش کی ہر جنبش میں دانیار کا گانا گونجے! اچھا ہے، میرے موقلم کی ہر حرکت میں جمیلہ کے دل کی دھڑکن سنائی دے!

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکر گذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار، نمبر ۲۱، ماسکو، سوویت یونین

21, Zubovsky Boulevard,

Moscow, U.S.S.R.

چنگیز ائتماتوف (سال پیدائش ۱۹۲۸ء) قرغیزیہ کے، جو سوویت یونین کی ایک جنوبی ریپبلک ہے، باجوہر نثرنگار ہیں۔ ائتماتوف کی پہلی بڑی تخلیق "جمیلہ" تھی جو ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ "دنیا میں محبت کی سب سے اچھی کہانی" یہ ہے مشہور فرانسیسی ادیب لوئی اراگون کی رائے "جمیلہ" کے بارے میں۔

اب چنگیز ائتماتوف کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں— "پہلا استاد"، "دھرتی ماتا"، اور "الوداع، گلسری!"۔ ۱۹۶۳ء میں ان کی "پہاڑوں اور میدانوں کی کہانیوں" کو لینن انعام عطا کیا گیا۔

چنگیز ائتماتوف قرغیزیہ کی راجدھانی فرونزے میں رہتے ہیں اور کام کرتے ہیں اور سوویت ادیبوں کی انجمن کے رہنماؤں میں سے ہیں۔

